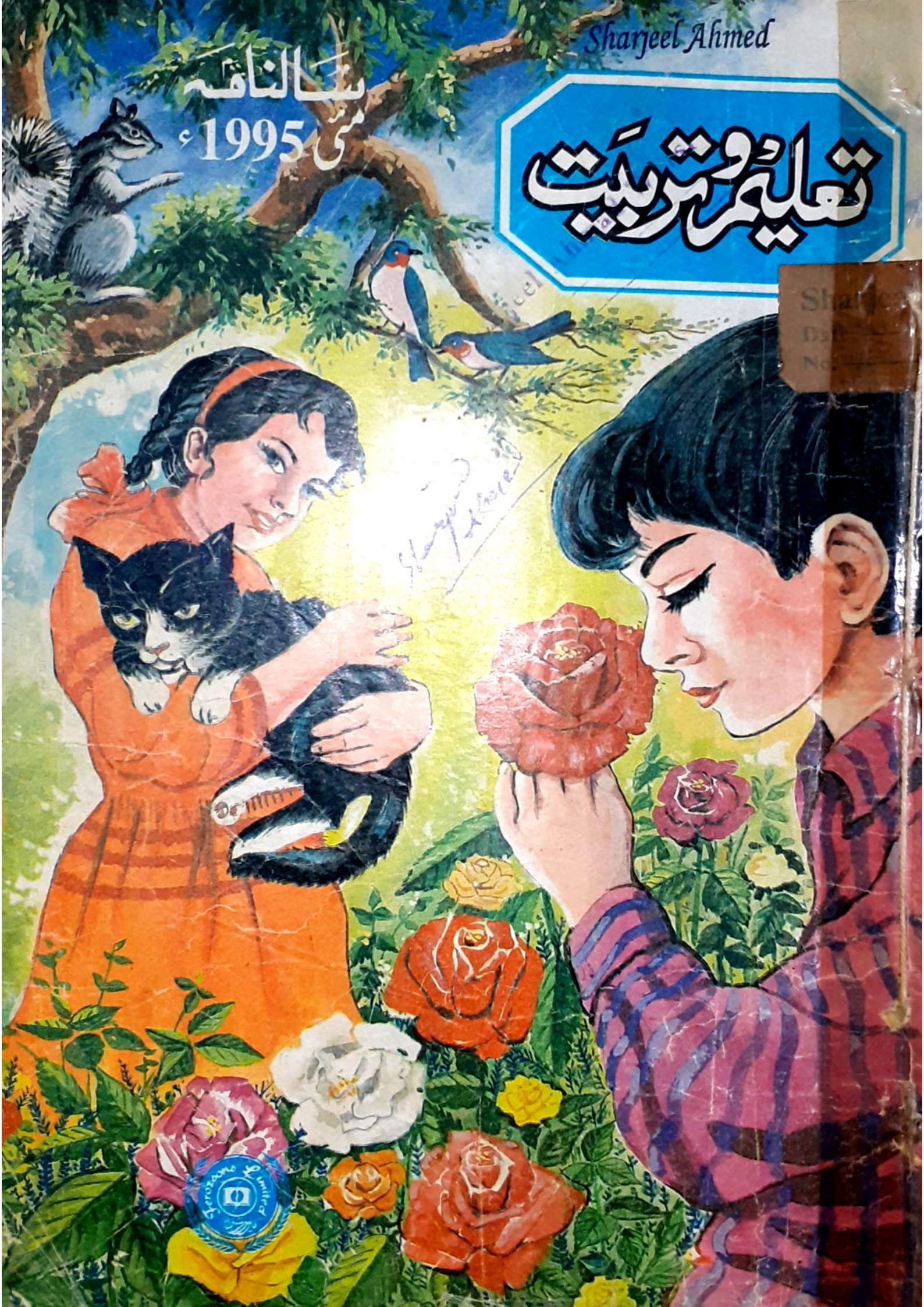

Sharjeel Ahmed

تعلیم و تربیت

سالنامہ
مئی 1995ء

55 واں سال
دوسرا شمارہ
تعلیم و تربیت
ستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا
بچوں کا محبوب رسالہ

ف ایڈیٹر	عبدالسلام
یٹر	سعید لخت
سٹنٹ ایڈیٹر:	رِضوان ثاقب
ٹرشنز و ڈیزائننگ	سید شوکت اعجاز
لیشن اسسٹنٹ	محمد بشیر راہی

طبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ)، لمیٹڈ لاہور
شر: ظہیر سلام
عبدالسلام

پتا
ماہنامہ تعلیم و تربیت
-3، شارع بن بادیس لاہور
ن: 6361309-6361310
6278815-6278816

سرکولیشن اور اکاؤنٹس
-6، شاہراہ قائدِ اعظم لاہور

سالانہ قیمت
ن میں (صرف رجسٹری کے ساتھ) -/250 روپے
طی / افریقہ (ہوائی ڈاک سے) -/475 روپے
(ہوائی ڈاک سے) -/675 روپے
/ مشرقِ بعید (ہوائی ڈاک سے) -/695 روپے

مئی 1995
قیمت فی پرچہ -/15 روپے

Sharjeel Ahmad Warsi
Date
No.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السّلامُ علیکمُ

یہ آپ کے تعلیم و تربیت کا 55 واں سال نامہ ہے۔ کیسا ہے؟ یہ تو آپ پڑھ کر ہی بتائیں گے۔ ہم نے اپنی طرف سے تو اِسے سنوارنے، سجانے اور زیادہ سے زیادہ دل چسپ بنانے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ ہمیں یقین ہے کہ پچھلے سال ناموں کی طرح یہ سال نامہ بھی آپ کی اُمیدوں پر پُورا اُترے گا۔

ذرا فہرست پر ایک نظر ڈالیے۔ آپ کو ادیبوں اور شاعروں کی ایک کہکشاں جگ مگاتی نظر آئے گی۔ یہ تمام لکھنے والے آپ کے جانے پہچانے ہیں اور اِن کی تحریریں آپ بہُت شوق سے پڑھتے ہیں۔

اور بھئی، اِس مہینے کی 10 یا 11 تاریخ کو مسلمانوں کا دوسرا بڑا تہوار، عیدُالاضحیٰ منایا جائے گا۔ اِسے بقر عید اور بڑی عید بھی کہتے ہیں۔ آپ کو خوشیوں بھرا یہ تہوار بہُت بہُت مُبارک ہو۔

اِس بابرکت تہوار پر مسلمان جانوروں کی قربانی کرکے اللہ کے برگزیدہ نبی حضرت اِبراہیم علیہِ السّلام کی قربانی کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ ہمارے پیارے نبی حضرت محمدؐ ﷺ کا اِرشاد ہے کہ قربانی کے گوشت کے تین حصّے کیے جائیں۔ ایک حصّہ قربانی کرنے والا خود رکھ لے، دوسرا حصّہ عزیزوں اور رشتے داروں میں تقسیم کرے، اور تیسرا حصّہ غریبوں میں بانٹ دے۔ غریبوں کے لیے گوشت خرید کر کھانا تقریباً ناممکن ہوگیا ہے۔ یہ بے چارے، قِسمت کے مارے، آپ کے طُفیل سال میں دو ایک دن گوشت کھا لیتے ہیں۔ ہوسکے تو اپنا حصّہ بھی اِنہیں دے دیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اِس کا اجر دے گا۔ (اڈیٹر)

اس شمارے میں

اداریہ		1
غبارے (نظم)	فرحت شاہجہانپوری	2
چچا بھکڑ نے چور پکڑا (کہانی)	ذکیہ بلگرامی	3
استادوں کا استاد (کہانی)	محمد یونس حسرت	8
جاسوس کمپنی (کہانی)	ف۔ عزیز	13
سرخ بتی (نظم)	قتیل شفائی	18
پچاس لاکھ کے نوٹ (کہانی)	ڈاکٹر رؤف پاریکھ	19
حج اور عید الاضحیٰ (درسِ قرآن)	ڈاکٹر عبدالرؤف	25
سنہری چیل (سنہری چڑیا)	ڈاکٹر نصیر احمد ناصر	26
نیلم پری (کہانی)	فوزیہ طاہرہ	28
آپ جانتے ہیں؟	س۔ل	33
کہانی سمندری جہاز کی (مضمون)	سلیم احمد صدیقی	34
ایک اچھا فیصلہ (کہانی)	سید نظر زیدی	39
جنگلی جانور بھی کھیلتے ہیں (مضمون)	سعید لخت	44
دل چسپ اور عجیب	س۔ل	47
علمی آزمائش		48
باتیں بڑوں کی		49
دھماکے کی واپسی (کہانی)	محمد ادریس قریشی	50
مجرم کون؟		55
گوے رے گوے (نظم)	حفیظ الرحمان احسن	57
استاد گوے (کہانی)	فاروق حسن جانڈیو	58
ہم نے بکرا خریدا (کہانی)	سید محمد جاوید	61
آپ بھی لکھیے		64
آئیے مسکرائیں (لطائف)		69
آپ کا خط ملا		70
پھر کھلونے والا (نظم)	ضیغم حیدری	73
چالاک لومڑی، بے وقوف شیر (کہانی)		74
اُس نے مجھے پہچان لیا (کہانی)	سلیم خاں گمی	75
ملاح اور کشتی (کہانی)	س۔ل	80

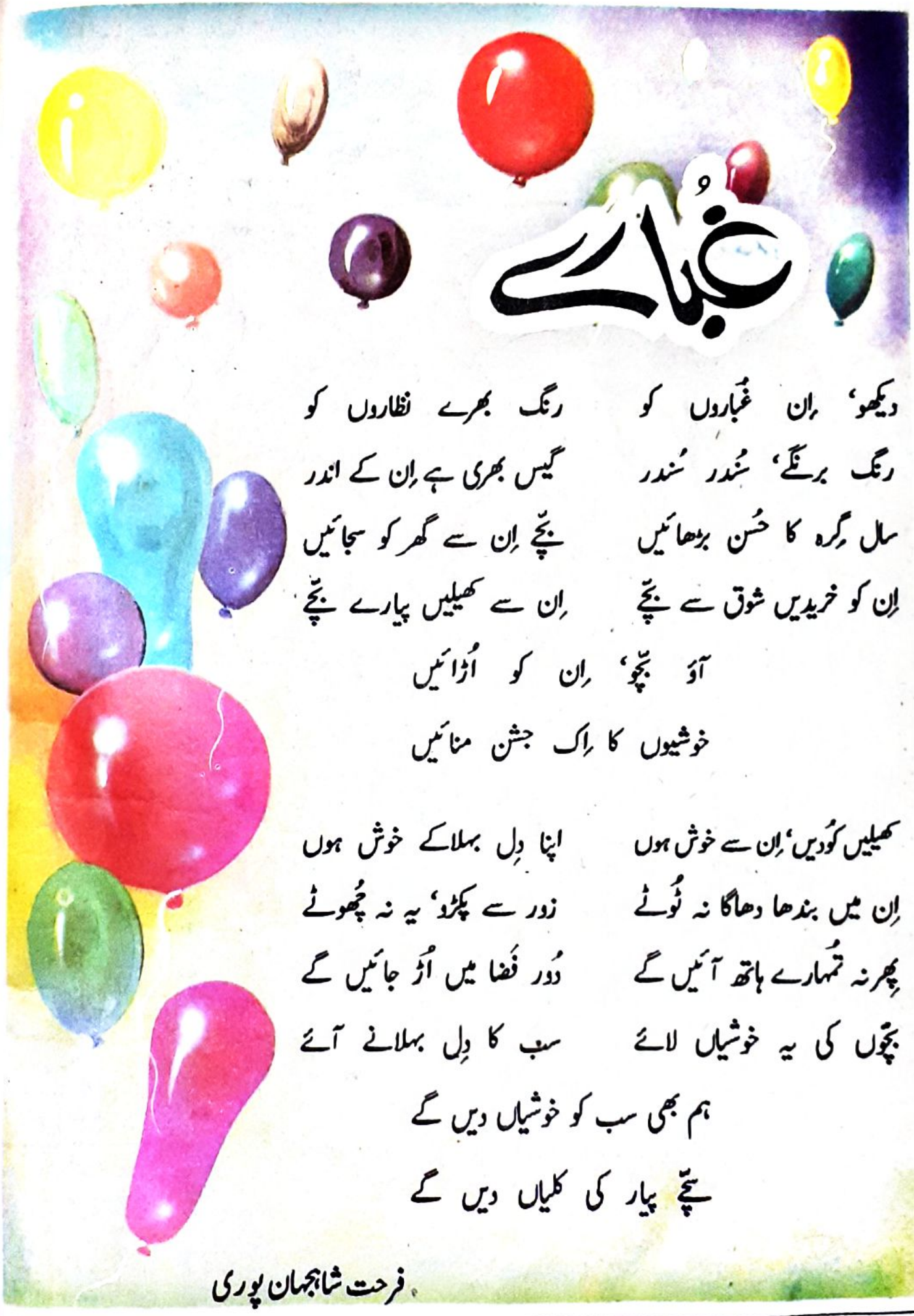

غُبارے

دیکھو، اِن غُباروں کو — رنگ بھرے نظاروں کو
رنگ برنگے، سُندر سُندر — گیس بھری ہے اِن کے اندر
سال گرہ کا حُسن بڑھائیں — بچّے اِن سے گھر کو سجائیں
اِن کو خریدیں شوق سے بچّے — اِن سے کھیلیں پیارے بچّے
آؤ بچّو، اِن کو اُڑائیں
خوشیوں کا اِک جشن منائیں

کھیلیں کُودیں، اِن سے خوش ہوں — اپنا دِل بہلاکے خوش ہوں
اِن میں بندھا دھاگا نہ ٹُوٹے — زور سے پکڑو، یہ نہ چھوٹے
پھر نہ تمہارے ہاتھ آئیں گے — دُور فَضا میں اُڑ جائیں گے
بچّوں کی یہ خوشیاں لائے — سب کا دِل بہلانے آئے
ہم بھی سب کو خوشیاں دیں گے
سچّے پیار کی کلیاں دیں گے

فرحت شاہجہان پوری

چچا بھلکڑ نے چور پکڑا

ذکیہ بلگرامی

چچا بھلکڑ جُوں ہی دفتر سے گھر آئے' بیوی نے خبر سُنائی "غضب ہوگیا! شوکت صاحِب کے ہاں ڈاکا پڑ گیا' دن دہاڑے"۔

"حیرت ہے! شوکت صاحِب تو بہت موٹے ہیں۔ ڈاکوؤں کی ہِمّت کیسے ہوئی اُن کے گھر میں گھُسنے کی؟ کیا کچھ لے گئے؟" چچا بُھلکڑ نے پُوچھا۔

"آپ بھی کمال کرتے ہیں' موٹاپے سے ڈاکے کا کیا تعلّق؟ پانچ آدمی تھے' ہتھیار بند۔ پستول دکھا کر گھر کا سب سامان لے گئے۔ بے چاری بیگم شوکت تو باقاعدہ رو رہی تھیں"۔

"اچھا بھئی' اب تُم تو بے قاعدہ مت رو۔ میں بہت تھکا ہُوا ہُوں۔ ایسا کرو' جلدی سے چائے دے دو۔"

"چائے تیّار ہے۔ آپ ہاتھ مُنہ دھولیں" حُمیرا یہ کہہ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔

چچا کو چائے دے کر وہ نزدیک ہی بیٹھ گئی۔ اُس نے کہا "مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔"

"ارے بھئی' کس بات کا ڈر؟" چچا بُھلکڑ چائے کا گھُونٹ بھر کر بولے۔

"محلّے میں کئی گھروں میں چوری ہو چکی ہے۔ آپ نے پانچ لاکھ روپوں کے اِنعام کا خوب چرچہ کیا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ----" حُمیرا کہتے کہتے رُک گئی۔

"ارے واہ! میں نے تو کسی سے کچھ نہیں کہا۔ بس محلّے والوں اور رشتے داروں کو بتایا۔ آفس والوں کو بھی معلوم ہوگیا' اور بس"۔

"تو پھر بچا کون؟ کیا اخبار میں اِشتہار دینے کا اِرادہ تھا؟ میں تو یہ چاہتی تھی کہ محلّے میں کسی کو خبر نہ ہوتی۔ مگر' خیر۔"

"یہ سب فضول باتیں ہیں۔ جب چور آئے گا تو دیکھا جائے گا" چچا بھلکڑ بولے۔

"اے ہے! خدا نہ کرے کہ ہمارے گھر چور آئے" حمیرا نے گھبرا کر کہا۔

"اچھا' اب اِس ذکر کو ختم کرو۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے" یہ کہہ کر چچا بھلکڑ پلنگ پر آڑے ترچھے لیٹ گئے اور آنکھیں بند کرلیں۔ عابِد اور شاہِد باہر کھیل رہے تھے۔ دونوں بھاگے بھاگے آئے۔

"ابّو، ابّو۔ موٹے صاحب کے گھر چور آئے تھے" عابد نے کہا۔

"موٹی چچی رو رہی تھیں" شاہد نے کہا۔

چچا بھلکڑ کو غُصّہ آگیا۔ ڈانٹ کر بچّوں کو بھگا دیا۔ بچّے رونے لگے۔ حُمیرا نے بچّوں کو چُپ کرایا اور اُنہیں دوسری طرف لے گئی۔ تھوڑی دیر میں چچا کے خرّاٹے کمرے میں گونجنے لگے۔

حمیرا نے بے بسی سے شوہر کی طرف دیکھا۔ کتنے آرام سے سو رہے ہیں۔ اِنہیں تو کچھ فِکر ہی نہیں ہے۔ بس اللہ ہی سے دُعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے امان میں رکھے۔

دن پر دن گزر رہے تھے۔ روزانہ اخبار لُوٹ مار کی خبروں سے بھرا ہوتا تھا۔ چچا تو بے فکر تھے مگر حمیرا کو اُن دِنوں ٹھیک طرح سے نیند نہ آتی تھی۔ ذرا سا کھٹکا ہوتا تو وہ جاگ جاتی اور دِل ہی دِل میں دُعا کرتی رہتی۔

حُمیرا کا اندیشہ کچھ غلط نہ تھا۔ ایک دن آدھی رات کے وقت اُس کے گھر میں ایک شخص باہر سے کُود کر اندر آگیا۔ اُس کی آنکھ کُھل گئی۔ وہ جلدی سے اُٹھی اور پوری قُوّت سے چِلّانا شروع کر دیا "چور! چور!"۔

محلّے کے گھر نزدیک نزدیک تھے۔ چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں "چور! چور!"

جو چور اندر کُودا تھا، وہ گھبرا کر باہر بھاگا۔ دوسرا باہر کھڑا تھا۔ وہ بھی سب کو جاگتا دیکھ کر بھاگ گیا۔

چچا بُھلکڑ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ننگے پیر چوروں کے پیچھے بھاگے۔ حُمیرا منع کرتی رہ گئی۔ مگر وہ کسی کی کہاں سُننے والے تھے۔ چوروں کے پیچھے بھاگے جا رہے تھے۔ اِتّفاق ایسا ہُوا کہ کسی نے پولیس کو فون کر دیا۔ چُوں کہ پولیس چوکی بِالکُل نزدیک تھی، اِس وجہ سے دو مِنٹ میں پولیس آگئی۔ اب پولیس والے بھی چوروں کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ ایک چور تو بھاگ گیا لیکن دوسرا چور پولیس والوں کے ہتّھے چڑھ گیا۔

یہ دوسرا چور چچا بھلکڑ تھے!

ایک پولیس والے نے ایک ہاتھ کَس کے چچا کی گُدّی پر لگایا اور بولا "اب بھاگ کے کہاں جائے گا۔ چل، تھانے چل۔ وہاں تیری خاطر کریں گے۔"

چچا بھلکڑ کے غصّے کی اِنتہا نہ رہی۔ تن فن ہو کر بولے "میں چچا ہوں، سارے محلّے کا۔ چور نہیں ہوں"۔

"اچھّا! ہمیں تڑی دیتا ہے۔ ابھی بتاتا ہوں" دوسرے پولیس والے نے کہا اور چچا کی پیٹھ پر ایک ڈنڈا رسید کر دیا۔

"میں تم سب کو بند کروادوں گا۔ سمجھا کیا ہے تم نے مجھے؟ میرا رشتے کا ایک بھائی ڈی ایس پی ہے۔ ابھی فون کرواتا ہوں" چچا پیٹھ سہلا کر بولے۔

"حُلیہ تو دیکھو ڈی ایس پی کے بھائی کا۔ نہ بدن پر کُرتا نہ پاؤں میں جُوتا۔ ہی ہی ہی" پولیس والے ہنسنے لگے۔

"میں کہتا ہوں، مجھے چھوڑ دو، ورنہ بہت پچھتاؤ گے" چچا بھلکڑ بولے۔

"پہلے تلاشی لو اِس کی" ایک سپاہی نے کہا۔

"کس جگہ تلاشی لُوں۔ بدن پر تو کچھ بھی نہیں ہے" دوسرا سپاہی بولا اور پھر سب قہقہے لگانے لگے۔

"تم لوگوں نے چوروں کو بھگا دیا۔ تم اُن سے ملے ہوئے ہو۔ میں سب جانتا ہوں۔ چھوڑوں گا نہیں تم کو" چچا بھلکڑ نے چیخ کر کہا۔

ابھی پولیس والے کچھ کہنے ہی والے تھے کہ محلّے کے لوگ آگئے۔ چچا بھلکڑ کے ایک پڑوسی نے پولیس والوں سے کہا "ارے! یہ آپ لوگوں نے کیا کیا؟ یہ تو چچا ہیں۔ اِنہی کے گھر تو چور گھُسے تھے"۔

"اچھا بھئی' ہوں گے چچا۔ شکل سے تو چور ہی لگ رہے ہیں" ایک پولیس والے نے بدتمیزی سے کہا۔

چچا نے اُس پولیس والے کے ایک ہاتھ رسید کر دیا۔ ممکن تھا کہ جھگڑا بڑھ جاتا کہ محلّے والوں نے کہ سُن کر مُعاملہ رفع دفع کروا دیا' اور یُوں چچا بھلکڑ پٹ پٹا کر گھر واپس آئے۔

حمیرا نے کہا "آپ کو چوروں کے پیچھے جانے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر وہ گولی مار دیتے تو؟"

"تم خاموش رہو جی۔ ہر وقت بولتی رہتی ہو" چچا بھلکڑ نے پولیس والوں کا غُصّہ بیوی پر نکالا اور پھر لمبی تان کر سو گئے۔ حمیرا پوری رات جاگتی رہی۔

دوسرے روز چھُٹّی تھی۔ چچا دہی لینے دُکان پر گئے تو وہاں گُزشتہ رات چچا کے گھر چوروں کے آنے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ شوکت صاحِب بھی کھڑے تھے۔

"چچا' آپ نے سخت غلطی کی۔ چوروں کے پیچھے نہیں جانا چاہیئے" دہی والے نے کہا۔

"بالکل جی۔ گولی وولی مار دیتے تو؟" ایک شخص بولا۔

"میرے خیال میں تو کوئی اُچکّا ہوگا۔ چوروں ڈاکوؤں کے پاس تو پستول ہوتے ہیں" شوکت صاحِب نے اپنی دو فُٹ موٹی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں' آپ ٹھیک کہتے ہیں" دہی والا بولا۔

چچا بھلکڑ شوکت صاحِب کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اُن کی

بات سُن کر اُن سے رہا نہ گیا۔ بولے "آپ کو تو ڈاکوؤں کا اچھا خاصا تجربہ ہے۔ سُنا ہے آپ کا سب کچھ لے گئے"۔

"ارے میاں' ڈاکو امیروں ہی کے گھر آتے ہیں۔ سامان تھا تو لے گئے۔ تمہارے گھر آکر اُنہیں شرمندہ تھوڑی ہونا تھا۔ وہ تو کوئی محلّے کے لڑکے وڑکے ہوں گے' جنہیں تم نے ڈاکو سمجھ لیا"۔

"ایسا مت بولو' بابو جی" دہی والے نے کہا "چچا کا پانچ لاکھ کا اِنعام نکلا ہے"۔

"پانچ لاکھ کیا چیز ہیں؟ پانچ لاکھ کا تو گز بھر کا پلاٹ بھی نہیں ملتا آج کل" یہ کہہ کر شوکت صاحِب نے پان کی پیک سڑک پر تھوکی اور وہاں سے چل دِیے۔

چچا کو غصّہ تو بہت آیا مگر خاموش رہے۔ دہی لے کر گھر واپس آئے اور شوکت صاحِب کی باتیں حُمیرا کو بتا کر بولے "عجب اِنسان ہیں شوکت صاحِب بھی۔ اِس پر بھی اِترا رہے

ہیں کہ اُن کے گھر ڈاکو آئے تھے"۔

"ارے چھوڑیے اُن کی باتوں کو۔ اُن کی بیوی بے چاری تو بہت دُکھی تھیں"۔ حُمیرا نے کہا۔

"اور میرے چور کے پیچھے بھاگنے پر بھی لوگ میرا مذاق اُڑا رہے تھے۔ یعنی کہ میں ڈرپوک ہوں۔ چور نہیں پکڑ سکتا" چچا گردن ہلا کر بولے۔

"یہ بات نہیں۔ دراصل وہ لوگ آپ کی بھلائی چاہتے ہیں" حمیرا نے نرمی سے کہا۔

"کوئی بھلائی ولائی نہیں چاہتا۔ مجھے نکما، ڈرپوک، بھلکڑ اور نہ جانے کیا کیا سمجھتے ہیں۔ مگر میں بھی اُن کو بتا دُوں گا کہ میں ایسا نہیں ہوں" چچا نے کہا۔

"آپ غصہ تھوک دیجیے۔ کوئی کچھ نہیں سمجھتا آپ کو" حُمیرا نے کہا۔

"لیکن میں اُن سب کو بتا دوں گا کہ میں ڈرپوک نہیں ہوں۔ اب کے چور آیا تو پکڑ کے سب کے سامنے نہ کھڑا کر دوں تو میرا نام چچا نہیں"۔ چچا اکڑ کر بولے۔

"آپ کا نام چچا کب ہے، شاد میاں ہے۔ اپنا نام بھی بھول گئے؟" حمیرا نے ہنس کر کہا۔

"مت ہنسو مجھے زہر لگ رہی ہیں اُن لوگوں کی باتیں" چچا غصّے سے بولے۔

"آپ تو واقعی بُرا مان گئے۔ اچھا، میں آپ کے لیے حلوا لے کر آتی ہوں" حُمیرا بولی۔

حلوا کھاتے ہوئے بھی چچا کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔

دو دِن گزرے تھے کہ محلّے کے ایک گھر میں پھر چوری ہوگئی، اور چور ہمیشہ کی طرح بھاگ گئے۔ چچا پُوری طرح چوکس تھے۔ حُمیرا رات کو آیتُ الکرسی پڑھ کر چاروں کونوں میں پھونکتی اور پھر دستک دے کر سونے کے لیے لیٹتی۔ اِس طرح دِل کو اِطمینان سا رہتا تھا۔

"آج میں دفتر سے گھر نہیں آؤں گا" چچا بھلکڑ نے دفتر جاتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ خیریت؟ کہاں جا رہے ہیں؟" بیوی نے پوچھا۔

"دفتر کے ایک ساتھی کے والِد کا اِنتقال ہوگیا ہے۔ اُن کے سوم میں جانا ہے۔ دفتر کے سب لوگ جا رہے ہیں"۔

"کب تک واپسی ہوگی؟" حُمیرا نے پُوچھا۔

"دیر ہو جائے گی۔ بہت دُور جانا ہے۔ شاید دس بج جائیں"۔

"اچھا، خُدا حافِظ" حمیرا نے کہا اور کچھ سوچتے ہوئے دروازہ بند کرلیا۔

چچا بھلکڑ کو گھر آتے آتے رات کے ساڑھے دس بج گئے۔ وہ سوم کا کھانا کھا کر آئے تھے، اِس لیے آتے ہی سوگئے۔

آدھی رات کو اچانک کھٹکا ہُوا۔ چچا کی آنکھ کھُل گئی۔ بلکہ آنکھ سے زیادہ کان کھُل گئے۔ حُمیرا اور بچّے بے خبر سو رہے تھے۔

چچا آہستہ سے ننگے پاؤں اُٹھے۔ گھر کے آنگن میں کوئی شخص تھا۔ گھُپ اندھیرے کی وجہ سے چچا کو اُس کی شکل صورت صاف دکھائی نہ دی۔ بس اِتنا پتا چلا کہ چور نے چادر اوڑھ رکھی ہے اور اُس کے قدم دوسرے کمرے کی جانِب بڑھ رہے ہیں۔

چچا نے چور کو پکڑنے کا اِنتظام پہلے سے کر رکھا تھا۔ اُنہوں نے پلنگ کے نیچے سے بوری نکالی، چپکے سے چور کے پیچھے گئے اور بوری کھول کر اُس کے سر پر ڈال دی۔ اُس کا آدھا دھڑ بوری میں بند ہوگیا۔ چچا اُسے گھسیٹ کر باورچی خانے میں لے گئے اور کُنڈی چڑھا دی۔

"بیگم! بیگم! جلدی اُٹھو۔ میں نے چور پکڑ لیا ہے!" چچا چِلّا کر بولے۔

حُمیرا گھبرا کر اُٹھ بیٹھی "خُدا خیر کرے! کہاں ہے، چور؟"

"میں نے اُسے باورچی خانے میں بند کر دیا ہے" چچا

بھلکڑ نے ہانپتے ہوئے کہا۔ چور باورچی خانے کا دروازہ زور زور سے پیٹ رہا تھا۔

"کھولنا مت' بیگم! صُبح کو شوکت صاحِب کو بُلا کر دکھاؤں گا"۔

حُمیرا کو اپنے میاں کی بہادُری پر حیرت بھی تھی اور خوشی بھی۔ بہرحال' وہ جلدی سے دوسرے کمرے کی طرف بھاگی تاکہ خالہ بی کو اُٹھا کر لائے۔ مگر اُن کا بستر خالی تھا! "یا اللہ! خالہ بی کہاں چلی گئیں؟" وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر بولی۔

چچا نے چُوں کہ رات کو دیر سے آنے کو کہا تھا' اِس لِیئے حُمیرا نے خالہ بی کو بُلا لیا تھا اور وہ دوسرے کمرے میں سو رہی تھیں۔ مگر اِس وقت اُن کا بستر خالی تھا۔

"ارے' سُنیے۔ خالہ بی یہاں سو رہی تھیں۔ پتا نہیں کہاں گئیں" حمیرا بولی۔

باورچی خانے کا دروازہ زور زور سے پیٹا جا رہا تھا۔ اور پھر خالہ بی کی آواز بھی حُمیرا نے صاف پہچان لی۔ اُس نے جلدی سے باورچی خانے کا دروازہ کھول دیا۔

خالہ کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ بال بِکھرے ہوئے تھے۔ مُنہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ جب اُن کے حواس کچھ ٹھیک ہوئے تو بولیں "اے شادمیاں' خوب پکڑا چور تم نے۔ شکر ہے کہ بوری ہی میں بند کر دیا' سر پر ڈنڈا نہیں مارا ورنہ میں تو اِس وقت اگلے جہان میں ہوتی"۔

چچا بھلکڑ ہَونقوں کی طرح کبھی خالہ کو دیکھتے اور کبھی حُمیرا کو۔ سٹ پٹا کر بولے "جب میں نے آپ کو بوری میں بند کیا تو آپ بولیں کیوں نہیں؟"

"بولتی کیا خاک" خالہ نے کہا "میرے تو اَوسان خطا ہوگئے تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ناگہانی آفت کہاں سے ٹُوٹ پڑی"۔

"لاحولَ ولا قُوّۃ" چچا خفا ہوکر بولے "اب میں شوکت صاحِب کو کیا دِکھاؤں گا؟"

حُمیرا بڑی مشکل سے ہنسی روک رہی تھی۔ چچا بھلکڑ کی اِس بات پر بے اِختیار ہنس پڑی۔ خالہ بھی مسکرانے لگیں۔ چچا بھلکڑ سر کھُجاتے ہوئے کمرے میں چلے گئے۔

محمد یونس حسرت

اُستادوں کا اُستاد

روشن کو ڈاکوؤں کی قید میں آئے کتنے ہی دِن ہوگئے تھے۔ اِتنے دنوں میں اُسے ڈاکوؤں کے مُتعلّق یہ تو معلوم ہوگیا تھا کہ ڈاکوؤں کا یہ گِروہ عِلاقے کا سب سے خطرناک گروہ ہے، مگر اِس گروہ کے پنجے سے رِہائی حاصل کرنے کی کوئی تدبیر اُس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ڈاکوؤں کے اِس گروہ نے مُسافِروں کو لُوٹ لُوٹ کر جو مال جمع کیا تھا، وہ کسی بادشاہ کے خزانے سے کم نہ تھا۔ وہ خُفیہ غار جو اِن ڈاکوؤں کا ٹھکانا تھا، اُس میں سونے، چاندی، ہیرے جواہرات اور ریشمی کپڑوں کے ڈھیر کے ڈھیر لگے تھے اور اِس خزانے میں آئے دن اِضافہ ہوتا رہتا تھا۔

اِس گروہ کے لوگ مُسافِروں کو لُوٹنے کے عِلاوہ شہروں اور قصبوں میں چوریاں بھی کرتے تھے۔ وہ فقیروں کے بھیس میں آبادیوں میں گھُوم پھِر کر پتا چلاتے کہ کس شخص کے پاس کتنا مال ہے۔ پھر جیسے ہی اُنہیں موقع ملتا، اُس شخص کا مال پار کرلیتے۔

فقیروں کے بھیس میں، آبادیوں میں گھومتے ہوئے، وہ ایسے لڑکوں کی تلاش میں بھی رہتے تھے جو مضبوط جِسم اور کُھلے ہاتھ پیر کے ہوں۔ موقع ملنے پر وہ ایسے لڑکوں کو اِغوا کرتے اور اپنے خفیہ ٹھکانے پر لاکر اُنہیں اِس بات پر آمادہ کرلیتے تھے کہ وہ اُن کے گِروہ کے لِیے کام کریں۔ اِس طرح اُن کے گروہ میں نیا خون شامل ہوتا رہتا تھا۔

جن لڑکوں کو وہ اِغوا کرکے لاتے تھے، اُن میں سے کسی کو بھی اِنکار کی جُرأت نہ ہوتی تھی کیوں کہ اُن کا کہنا نہ ماننے کا نتیجہ موت ہوتا تھا۔ اور موت بھی سیدھی سادی موت نہیں، نہایت تکلیف دِہ موت! وہ اپنا حکم نہ ماننے والوں کو طرح طرح کی اِیذائیں دے کر ہلاک کرتے تھے۔

علاقے میں ڈاکوؤں کے اِس خطرناک گروہ کی اِتنی دہشت پھیلی ہوئی تھی کہ اِس گروہ کا ایک آدمی نعرہ مار کر سڑک پر نمودار ہوتا تو مُسافروں کا قافلے کا قافلہ اپنا سارا مال چُپ چاپ اُس کے حوالے کردیتا۔ مُسافر سمجھتے تھے کہ دوسرے ڈاکو کہیں آس پاس ہی چھُپے ہوں گے اور مُقابلہ کرنے کی صورت میں وہ کسی ایک مسافر کو بھی جیتا نہ چھوڑیں گے۔ روشن کو بھی اِن ڈاکوؤں نے اِسی لیے اِغوا کیا تھا کہ وہ مضبوط جسم اور کھُلے ہاتھ پَیر کا تھا۔ مگر اُس کا دِل بُرائی کے اُس راستے پر چلنے پر آمادہ نہ تھا، جس پر یہ ڈاکو بے دھڑک چل رہے تھے۔

مضبوط جسم اور کھلے ہاتھ پاؤں کے لڑکے اکثر اپنے آپ کو بہادر جتانے کے شوق میں کوئی نہ کوئی حرکت ایسی کرگزرتے ہیں جو اُن کے بُرائی کے جال میں پھنس جانے کا باعث بن جاتی ہے۔ مگر روشن مضبوط جسم اور کھُلے ہاتھ پاؤں ہی کا مالک نہ تھا، اللہ تعالیٰ نے اُس کے نام کی طرح اُسے عقل کی روشنی بھی بخشی تھی۔ جب سے وہ ڈاکوؤں کی قید میں آیا تھا، تب سے برابر یہ سوچتا رہتا تھا کہ اُسے اِس مُصیبت سے کیسے نجات مل سکتی ہے۔ سوچتے سوچتے اُس نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ اپنی عقل کو ایک طرف رکھ دے اور اِن ڈاکوؤں کے سامنے بالکل بُدّھو اور کاٹھ کا اُلّو بن جائے۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد وہ ڈاکوؤں کی ہر بات پر احمقوں کے انداز میں سرہلا دیتا۔ بات بے بات ہاں، جی ہاں، کہنا اُس کی عادت بن گئی تھی اور ڈاکوؤں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ یہ اُن کے لیے بڑے کام کا لڑکا ثابت ہوگا۔ چُناں چہ ایک رات ڈاکوؤں کے سردار نے اُسے بُلایا اور کہا، "سُنو لڑکے! آج تم پہلی واردات کرو گے۔ سڑک پر جاؤ اور سب مُسافروں کے بٹوے چھین لاؤ!"

یہ کہتے ہوئے ڈاکوؤں کا سردار اپنے پیلے پیلے دانت نکال کر ڈراؤنی ہنسی ہنسا۔ روشن اُس کی بات سُن کر دل میں ڈرا تو بہت مگر اُس نے احمقوں کی طرح سر آگے پیچھے ہلاتے ہوئے کہا "اچھّا جی۔ ہاں جی۔ ہاں جی۔"

اِس کے ساتھ ہی اُس نے بے وقوفوں کی طرح دانت نکال دیے۔ اُسے اِس طرح ہنستے دیکھ کر ڈاکوؤں کا سردار شک میں پڑ گیا کہ پتا نہیں یہ لڑکا اُس کی بات کو پورے طور پر سمجھا بھی ہے کہ نہیں۔ مگر اُس نے اِس بارے میں روشن سے کچھ نہیں کہا اور اُسے اُس کی پہلی مُہم پر بھیج دیا۔

روشن ڈاکوؤں کے سردار کے حکم کے مطابق سڑک پر گیا۔ وہاں پر مُسافر آجارہے تھے۔ اُس نے زور سے نعرہ لگایا اور پھر گلے کی پُوری قُوّت سے چیخ کر کہا:

"نکالو اپنے اپنے بٹوے، نہیں تو جان سے جاؤ گے!"

کسی مُسافر نے یہ خیال کرنے کی تکلیف نہیں کی کہ بٹوے نکالنے کا حکم دینے والا ایک لڑکا ہے اور وہ چاہیں تو بڑی آسانی سے اِس کو قابُو میں کرسکتے ہیں۔ وہ تو اُس کا نعرہ سُن کر ہی خوف زدہ ہوگئے تھے۔ چُناں چہ اُن کے قدم وہیں رُک گئے اور اُنھوں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے اپنے بٹوے نکال کر روشن کی طرف بڑھادیے۔

روشن نے اُن بٹوؤں کو ایک ایک کرکے کھولا، اور اُن میں سے سونے کی اشرفیاں اور چاندی کے روپے نکال کر واپس مسافروں کو دے دیے۔ پھر اُس نے کہا "میرے سردار نے مجھے صِرف تمہارے بٹوے لانے کا حکم دیا تھا۔"

مسافروں نے کچھ کہنے سُننے کی زحمت گوارا نہ کی اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہُوئے۔

روشن بٹوؤں کا ڈھیر اُٹھائے واپس غار کی طرف چل دیا۔ اُن میں نئے بھی تھے اور پُرانے بھی، چمڑے کے بھی تھے اور ریشم کے بھی، سادہ کپڑے کے بھی تھے اور خوب صورت بیل بوٹوں والے بھی۔ اُس نے غار کے دروازے پر پہنچ کر بٹوؤں کا ڈھیر ڈاکوؤں کے سردار کے آگے ڈال دیا اور بڑے فخر سے کہنے لگا:

"سردار! یہ رہے وہ بٹوے جو میں آپ کے حکم کے مُطابق مُسافروں سے چھین کر لایا ہُوں" اور یہ کہتے ہوئے وہ احمقوں کی طرح ہنسنے لگا۔

بٹوؤں پر نظر ڈالتے ہی سردار کو معلوم ہوگیا کہ وہ خالی ہیں اور اُن میں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ وہ غصّے سے چیخا "اُلّو! گدھے! احمق! میں یہ خالی بٹوے لے کر کیا کروں؟ اِن بٹوؤں کو پیسوں سمیت لانا تھا"۔

مُجھ سے غلطی ہوگئی' سردار!" روشن نے کہا اور یہ کہتے ہوئے اُس کا مُنہ لٹک گیا۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر ڈاکوؤں کے سردار کو ترس آگیا۔ اُس نے اپنے غصّے پر قابُو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

"سُنو! کل رات تم پھر سڑک پر جاؤ گے اور مسافروں کے بٹوے پیسوں سمیت لے کر آؤ گے۔ سُن رہے ہو؟ بٹوے پیسوں سمیت لے کر آؤ گے!"

"اچھّا جی! ہاں جی! ہاں جی!" روشن نے جواب میں کہا اور ساتھ ہی بے وقوفوں کی طرح دانت نکال دیے۔

اُسے ہنستے دیکھ کر ڈاکوؤں کا سردار ایک بار پھر شک میں پڑگیا کہ یہ لڑکا اُس کی بات کو پورے طور پر سمجھا بھی ہے کہ نہیں۔ مگر پھر اُس نے سوچا کہ احمق سے احمق لڑکا بھی اِتنا احمق نہیں ہو سکتا کہ وہ اُس صاف اور سیدھی سی بات کو بھی نہ سمجھ سکے جو اُس نے ابھی ابھی اِس لڑکے سے کی ہے۔ چُناں چہ وہ یہ سوچ کر بے فکر ہوگیا کہ اب کی بار یہ لڑکا کوئی حماقت نہیں کرے گا۔

اگلی رات روشن پھر سردار کے حُکم کے مُطابق سڑک کی طرف چل دیا۔ پچھلی رات کی طرح اب بھی سڑک پر مُسافر آ جارہے تھے۔ روشن نے زور سے نعرہ لگایا اور پھر گلے کی پُوری قوّت سے چیخ کر کہا "نکالو اپنے اپنے پیسے۔ نہیں تو جان سے جاؤ گے!"

اِس بار بھی کسی مسافر نے یہ خیال کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی کہ پیسے نکالنے کا مُطالبہ کرنے والا ایک لڑکا ہے اور وہ چاہیں تو بڑی آسانی سے اِس کو قابُو میں کرسکتے ہیں۔ وہ تو اُس کا نعرہ سُن کر ہی خوف زدہ ہوگئے تھے۔ چُناں چہ اُن کے قدم وہیں رُک گئے اور اُنہوں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے اپنے بٹوے نِکال کر روشن کی طرف بڑھادیے۔ وہ اشرفیوں' چاندی کے روپوں اور تانبے کے پیسوں سے بھرے ہوئے تھے۔

روشن نے بٹوؤں کو ایک ایک کرکے کھولا اور ان میں سے سونے کی اشرفیاں اور چاندی کے روپے نکال کر مسافروں کو دے دِیے اور تانبے کے پیسے اپنے تھیلے میں ڈال لیے۔ پھر اُس نے خالی بٹوے مسافروں کو واپس کرتے ہوئے کہا "میرے سردار نے مجھے صِرف تمہارے پیسے لانے کا حکم دیا تھا"۔ تانبے کے پیسوں کا نقصان مسافروں کے لیے کوئی بہت بڑا نقصان نہ تھا۔ اُنہوں نے اپنی اشرفیاں اور روپے بٹوؤں میں ڈالے اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

روشن تانبے کے پیسوں سے بھرا ہُوا تھیلا اُٹھا کر غار کی طرف چل دیا۔ اُس نے غار کے دروازے پر پہنچ کر تھیلے سے تانبے کے پیسے نکالے اور سردار کے سامنے زمین پر ڈھیر کرکے سِینہ پُھلا کر بولا "سردار، یہ ہیں وہ پیسے جو میں آپ کے حکم کے مُطابق مُسافروں سے چھین کر لایا ہُوں!"

سردار کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ تانبے کے پیسے دیکھ کر اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ غصّے سے دہاڑا "یہ تو تانبے کے پیسے ہیں! سونے کی اشرفیاں کہاں ہیں؟ چاندی کے روپے کہاں ہیں؟"

روشن نے بڑے بھول پن سے جواب دیا "سردار' آپ نے پیسے لانے کا حکم دیا تھا' اور پیسے تو تانبے ہی کے ہوتے ہیں۔"

"اُلّو! گدھے! احمق!"

سردار یہ کہہ کر روشن کو مارنے کے لیے اُس کی طرف بڑھا مگر پھر کچھ سوچ کر خود ہی رُک گیا۔ اُس کے دِل میں خیال آیا کہ اُس نے شاید بات ہی ایسے الفاظ میں کی تھی کہ لڑکا اُس کا صحیح مطلب نہیں سمجھ سکا۔ پہلی دفعہ اُس نے بٹوے کہا تھا تو لڑکا سونے چاندی کو چھوڑ کر خالی بٹوے لے آیا تھا۔ دوسری دفعہ اُس نے پیسوں کی بات کی تو وہ سونے چاندی کے سِکّوں کو چھوڑ کر تانبے کے پیسے لے آیا۔ شاید

وہ اپنی بات اِس لڑکے کو پورے طور پر نہیں سمجھا سکا تھا۔ یہ خیال کرکے اُس نے کہا:

"سُنو' لڑکے! تم ایک دفعہ پھر سڑک پر جاؤ گے اور مسافروں کے پاس جو کچھ بھی ہوگا وہ سب لے کر آؤ گے۔ سمجھ رہے ہو؟ سب کچھ لے کر آؤ گے۔ کوئی چیز بھی چھوڑ کر نہیں آؤ گے!"

یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنے پیلے پیلے دانت نکالے اور ڈراؤنی ہنسی ہنستے ہوئے روشن کی طرف گھُور کر دیکھا۔ روشن دِل میں ڈرا تو بہُت مگر اُس نے احمقوں کی طرح سر کو زور زور سے ہِلاتے ہوئے کہا:

"اچھا جی! ہاں جی! ہاں جی!"

سردار نے یکایک ہاتھ بڑھاکر روشن کا گلا دبوچ لیا اور کہا "کیا ہاں جی؟ بتاؤ' کیا کہا ہے میں نے؟"

روشن بدحواس سا ہوگیا۔ اُس کے گلے پر سردار کے ہاتھ کی پکڑ خاصی سخت تھی۔ اُس نے مُشکِل سے سانس لیا اور پھر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے رُک رُک کر کہا "آپ نے ..... آپ نے ..... یہ کہا ہے' سردار .... کہ مُسافِروں کا سب کچھ لے کر آنا ہے۔ کوئی چیز چھوڑنی نہیں ہے۔"

یہ سُن کر سردار نے روشن کا گلا چھوڑ دیا اور پیلے پیلے دانت نکالتے ہوئے کہنے لگا "ہاں' میں نے یہی کہا ہے۔ تُمھیں یہی کرنا ہے۔ سب کچھ لے کر آنا ہے۔"

اچّھا جی! ہاں جی! ہاں جی!"

روشن نے یہ کہَ کر ایک بار پھر بے وقوفوں کی طرح دانت نکال دِیے۔ اُسے اِس طرح ہنستا دیکھ کر سردار کو شک ہُوا کہ شاید یہ لڑکا اب بھی اُس کی بات کو پُورے طور پر نہیں سمجھا۔ مگر پھر اُس نے اِس شک کو ذہن سے جھٹک دیا۔ لڑکا خود اپنی زبان سے کہَ چُکا تھا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ اِس لِیے کسی غلطی کا اِمکان نہ تھا۔

اگلی رات روشن تیسری اور آخری بار اپنی مُہم پر روانہ ہُوا۔ سڑک پر پہلے کی طرح مسافر آجارہے تھے مگر اِس دفعہ اُس نے سڑک پر پہنچ کر نعرہ نہیں لگایا۔ اِس کی بجائے وہ سڑک کے عین درمیان کھڑا ہوگیا اور دونوں بازو پھیلاکر چیخ چیخ کر کہنے لگا:

"لوگو! میری بات سُنو! لوگو! میری بات سُنو!"

مُسافِروں نے دیکھا کہ چاند کی چاندنی میں ایک لڑکا عین سڑک کے درمیان کھڑا اُنہیں پُکار رہا ہے۔ وہ رُک گئے اور روشن اُن سے باتیں کرنے لگا۔ پھر اور مسافر آگئے۔ وہ بھی رُک گئے اور روشن اُن سے باتیں کرتا رہا۔ مسافر آتے رہے اور رُکتے رہے۔ روشن اُن سے باتیں کرتا رہا۔

جب رات کا اندھیرا ختم ہُوا اور دِن کا اُجالا پھیلا تو

روشن کے اِردگرد سینکڑوں مُسافر جمع ہو چکے تھے۔ اُس نے اُن سب کو ساتھ لیا اور وہ اُس کے پیچھے پیچھے اُس پہاڑی پر چڑھنے لگے جس کے ایک سِرے پر ڈاکوؤں کا غار تھا۔

روشن کے ساتھ مسافر غار میں پہنچے تو سارے ڈاکو مزے سے سو رہے تھے۔ خود ڈاکوؤں کا سردار بھی گہری نیند میں تھا۔ شاید اُسے اِطمینان تھا کہ اب کے روشن سے کوئی غلطی نہیں ہوگی اور وہ مسافروں سے سب کچھ چھین کر لے آئے گا۔

ڈاکوؤں کو گہری نیند سوتے دیکھ کر روشن اور دوسرے مسافروں نے اِشاروں ہی اِشاروں میں باتیں کیں اور پھر نہایت پھُرتی سے ڈاکوؤں کے تمام ہتھیار جمع کر کے ایک بڑے تھیلے میں ڈال دِیے اور تھیلے کو غار سے خاصی دُور لے جا کر رکھ دیا۔

اِس کام سے فارِغ ہو کر روشن نے ڈاکوؤں کے سردار کو جگایا۔ وہ آنکھیں ملتا ہُوا اُٹھا اور اپنے سامنے ڈھیر سارے آدمیوں کو دیکھ کر پہلے تو حیران ہُوا پھر غصّے سے چیختے ہُوئے کہنے لگا "یہ سب کیا ہے، لڑکے؟"

روشن نے احمقوں کی طرح دانت نکالتے ہوئے جواب دیا "سردار، آپ نے مجھے مسافروں کی ہر چیز لانے کا حکم دیا تھا۔ میں اُن کی تمام چیزیں خود تو نہیں اُٹھا سکتا تھا، اِس لیے اُن کو اُن کی چیزوں سمیت لے آیا ہُوں۔"

ڈاکوؤں کے سردار نے مسافروں کی طرف دیکھا اور پھر بڑے رُعب سے بولا "اپنی اپنی چیزیں یہاں رکھ دو اور چلے جاؤ!"

سردار کے اِس حکم کے جواب میں مسافروں کے ہنسنے کی آوازیں آئیں تو اُس نے چونک کر اُن کی طرف دیکھا۔ ڈاکوؤں کے پنجے میں پھنسنے کے بعد مسافروں کی جو حالت ہوتی ہے اور وہ جس طرح بے چارگی اور بے بسی کی تصویر بنے ہوتے ہیں، وہ حالت اِن میں سے کسی کے چہرے پر نہ تھی۔ وہ غصّے میں آ کر اُٹھ بیٹھا اور بے اِختیار اُس کا ہاتھ اپنی تلوار والی پیٹی کی طرف بڑھا۔ مگر اُس کی تلوار وہاں موجود نہ تھی۔ اِتنے میں دوسرے ڈاکو بھی جاگ گئے تھے اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے تھے کہ اُن کے سارے ہتھیار غائب ہیں۔ دوسری طرف مسافر تلواروں، خنجروں اور دوسرے ہتھیاروں سے مُسلّح نظر آ رہے تھے۔ اور تو اور، خود روشن بھی اپنے ایک ہاتھ میں ایک لمبی سی تلوار تھامے ہوئے تھا۔

ڈاکوؤں کو سارا مُعاملہ سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ خاص طور پر ڈاکوؤں کا سردار تو فوراً سمجھ گیا کہ وہ روشن جو اُس کی بات سُن کر بے وقوفوں کی طرح دانت نکال دیتا تھا، غضب کا چالاک اور عقل مند ہے، اور اُس نے اپنی چالاکی پر بے وقوفی کا پردہ ڈال کر خود اُن سب کو بے وقوف بنایا ہے۔ نہ صرف بے وقوف بنایا ہے بلکہ اُنہیں نہتّا اور بے بس بھی کر دیا ہے۔

نہتّے اور بے بس ہو جانے کے بعد ڈاکوؤں کے لیے سوائے اِس کے اور کوئی صورت نہ رہ گئی تھی کہ وہ اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیں۔ چُناں چہ مسافروں نے اِن تمام کو گرفتار کر کے کوتوال کے حوالے کر دیا۔ غار سے جو سونے چاندی کے سکّے، ہیرے جواہرات اور دوسری قیمتی چیزیں برآمد ہوئیں، اُنہیں سرکاری خزانے میں جمع کرا دیا گیا اور ڈاکوؤں کو قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ اِس طرح ایک لڑکے کی ذِہانت اور عقل مندی سے ڈاکوؤں کے ایک ایسے خطرناک گروہ کا خاتمہ ہُوا جس نے سارے عِلاقے میں تباہی مچا رکھی تھی۔

اِس واقعے کو صدیاں گزر گئی ہیں۔ آج نہ سونے کی اشرفیاں ہیں، نہ چاندی کے روپے اور نہ تانبے کے پیسے۔ مگر اُس پہاڑی کے آس پاس کے دیہات کے بڑے بوڑھے آج بھی اپنے بچّوں کو اُس ذہین اور چالاک لڑکے کی کہانی سُناتے ہیں جس نے ایک احمق اور بے وقوف لڑکا بن کر ڈاکوؤں کو بے وقوف بنایا تھا اور ڈاکوؤں کے ایک خطرناک گروہ کا خاتمہ کیا تھا۔

Sharjeel Ahmed

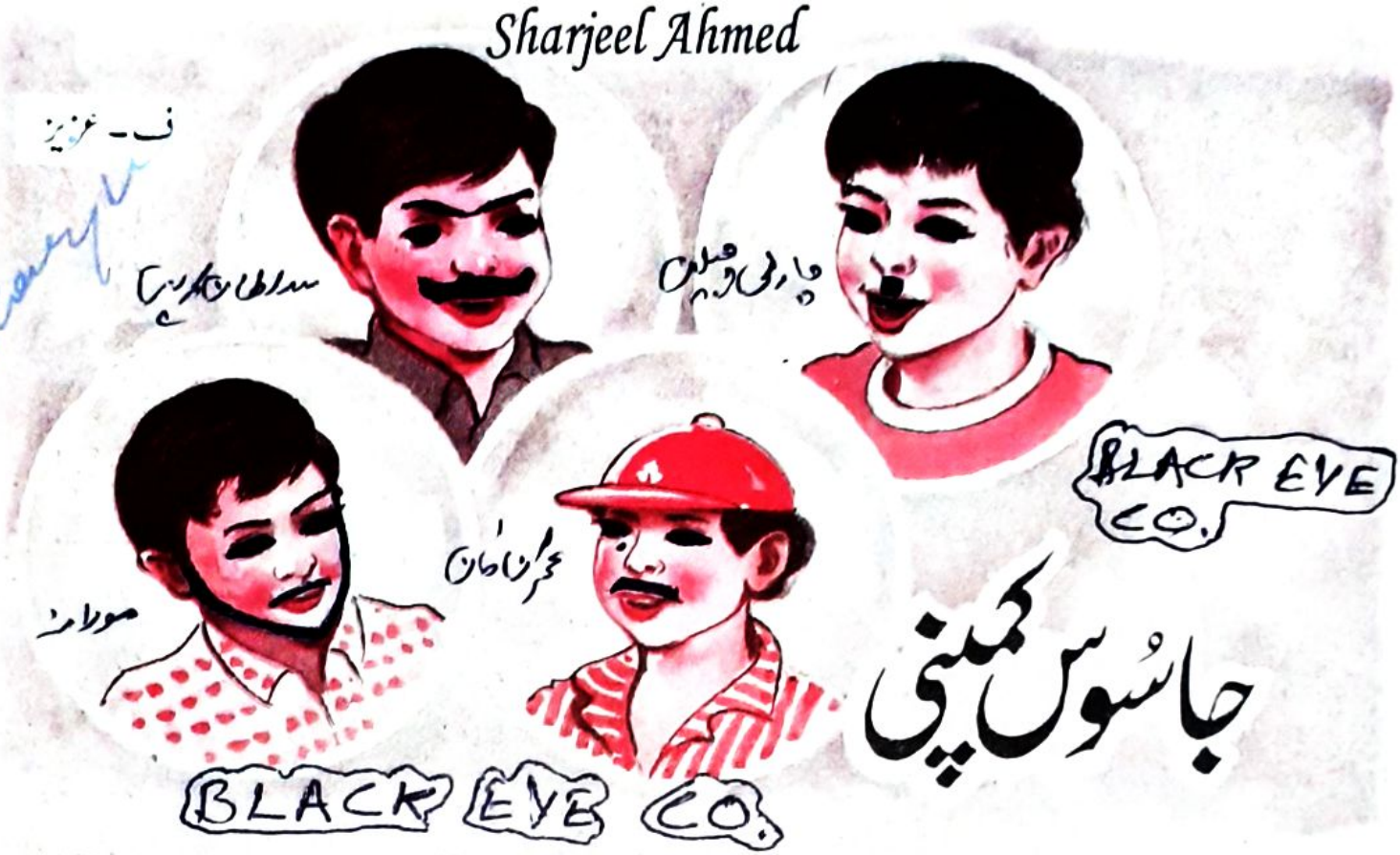

جاسوس کمپنی

"یار، یہ خُفیہ ایجنسیاں کیا شے ہیں، اور کون لوگ اِنہیں چلاتے ہیں؟ اخباروں میں بڑا ذِکر ہوتا ہے اِن کا" فرخ نے اخبار رکھتے ہوئے کہا۔

"جناب عقل مند صاحِب، اگر لوگوں کو پتا ہو کہ کون شخص خُفیہ ایجنسی میں کام کرتا ہے اور اُس کا دفتر کہاں ہے تو اُسے خُفیہ کیوں کہا جائے؟ بھائی میرے، جس طرح خفیہ پولیس ہوتی ہے، اِسی طرح حکومت کے تحت بہُت سے ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اہم معلومات حاصل کرکے حکومت تک پہنچاتے ہیں۔ اِسے خفیہ ایجنسی کہتے ہیں، اور ہر ملک میں ایسی ایجنسیاں ہوتی ہیں۔ امریکا میں اِسے سی آئی اے، اِنڈیا میں را اور روس میں کے جی بی کہتے ہیں۔ اِن ایجنسیوں کے لوگ دوسرے ملکوں میں جاسوسی بھی کرتے ہیں" فہیم نے کہا۔

"ہائے! کیا مزے کی زندگی ہوتی ہوگی اِن لوگوں کی۔ ہر وقت ایکشن، مُہم جوئی اور سسپنس۔ بالکُل جاسوسی ناولوں اور فلموں کی طرح۔ کاش! ہم بھی ایسی زندگی گزار سکیں" فرخ نے حسرت سے کہا۔

"جان ہتھیلی پر لے کر پھرنا پڑتا ہے اِس کام میں۔ ویسے ہم بھی اِن ایجنسیوں میں کام کرسکتے ہیں۔ بشرطے کہ ہم میں وہ خصُوصیّات ہوں جو ایسے کاموں کے لِیے ضروری ہیں" فہیم نے کہا۔

"کیا خوبیاں چاہئیں؟ ذرا تفصیل سے بیان کرو" اسد نے دل چسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"مثلاً سب سے اہم چیز تو وسیع مُطالعہ ہے۔ تاریخ، جغرافیہ، سیاست اور حالاتِ حاضِرہ کے بارے میں مکمّل معلومات، انگریزی پر مکمّل عبُور۔ تیز مُشاہدہ، بہترین یادداشت، جسمانی اور ذہنی مضبوطی، فوری قُوّتِ فیصلہ وغیرہ وغیرہ۔ فی الحال ہم پہلی شرط ہی پوری نہیں کرسکتے۔ کیوں کہ ابھی ہم نے میٹرک کا اِمتحان بھی نہیں دیا۔ اِس لِیے بہتر یہ ہے کہ اپنی ساری توجُّہ پڑھائی کی طرف رکھو" فہیم نے کہا۔

"پڑھائی تو ہم کر ہی رہے ہیں۔ کیوں نہ اِس کے ساتھ اپنی ٹریننگ بھی شروع کردیں، تاکہ تعلیم مکمّل کرنے کے بعد ہم آسانی سے کسی خفیہ ایجنسی میں جاسکیں" فرخ بولا۔

"ویسے جسمانی صِحّت کے لِیے تو ہم ورزش کرتے ہی ہیں۔ باقی خصوصیّات حاصل کرنے کے لِیے پریکٹس شروع کرنی چاہیے۔ اِس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے اِرد

گرد چیزوں کو بہت غور سے دیکھیں، اپنے طور پر جاسوسی کرنے کی کوشش کریں اور کوئی چھوٹا موٹا کیس حل کریں" ذی شان بولا۔

"ویسے آئیڈیا بُرا نہیں۔ اِس طرح کی مشقوں سے ہم آنے والے کل کے لیے اپنے آپ کو تیار کر سکیں گے۔ ویسے بھی ہم سب کو جاسوسی کا شوق بھی تو بہت ہے" اسد نے کہا۔

"پھر ملاؤ ہاتھ" چاروں نے بڑے جوش سے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

"بھئی، اِس جاسوس کمپنی کا ہیڈ کوارٹر میرا کمرا ہوگا" ذی شان نے کہا۔

اگلے دن اِسکول بریک ٹائم میں چاروں دوست گراؤنڈ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

"ہماری کمپنی تو بن گئی۔ اب کوئی کیس تو لاؤ" اسد نے بھُٹا کھاتے ہوئے کہا۔

"کیس کیا بٹ رہے ہیں جو جاکر لے آئیں؟ اپنے اِردگرد نظر رکھو۔ کئی کیس ملیں گے" فہیم نے کہا۔

"میرے خیال میں تو اِس بھُٹے والے کی جاسوسی کرتے ہیں۔ یہ یقیناً اپنے بھُٹوں پر کوئی نشیلی چیز لگاتا ہے۔ اِسی لیے تو ہر روز بھُٹا کھانے کو دل چاہتا ہے" ذیشان بولا۔

"اِس میں قصور بھُٹے والے کا نہیں، تمہاری نیت کا ہے۔ تم ایسے ندیدے ہو کہ کھانے کی ہر چیز پر تمہارا دل مچلتا ہے۔ اِس لیے روز بروز تمہاری چوڑائی بڑھتی جارہی ہے" فرخ نے چوٹ کی کیوں کہ اِن چاروں میں ذیشان ہی ذرا موٹا تھا۔

"یار، لڑائی بند کرو اور اُدھر دیکھو۔ یہ جو چوکی دار ہے، مجھے تو یہ کچھ مشکوک سا لگتا ہے۔ اِتنی بڑی بڑی تو اِس کی مونچھیں ہیں" اسد نے گیٹ کے قریب بیٹھے ہوئے چوکیدار کی طرف اشارہ کیا۔

"تمہیں تو ہر شخص مشکوک لگتا ہے۔ کل آئینہ دیکھ کر کہو گے کہ دیکھو، یہ کوئی مشکوک آدمی ہے۔ رہی مونچھوں کی بات تو فاروق چچا کی مونچھیں بھی بڑی بڑی ہیں۔ کیا وہ بھی مشکوک ہیں؟" فہیم نے بھنّا کر کہا "کچھ نہیں ہو سکتا اِس کمپنی سے۔ بالکل احمق ہو تم تینوں"۔

"اور آپ تو جیسے شرلاک ہومز کے شاگرد ہیں" ذیشان نے جل کر کہا۔

"شاگرد تو اُس کے تم جیسے ہی تھے۔ میں تو خود شرلاک ہومز ہوں" فہیم نے کہا۔

"مسٹر ہومز، فزکس کا پیریڈ شروع ہونے والا ہے۔ ذرا چل کر سر کو نیوٹن لاز سمجھائیے۔" گھنٹی کی آواز پر اُٹھتے ہوئے ذیشان نے کہا۔

چھٹی کے بعد چاروں اکٹھے باہر نکلے۔ ستمبر کا مہینا تھا۔ موسم ابھی خاصا گرم تھا۔ اُس وقت سڑکوں پر بہت رش تھا۔ چاروں اِسکول بس کی طرف بڑھے، لیکن اُنہیں یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ بس کا ٹائر پنکچر ہو گیا ہے۔ اب اُسے بدلا جارہا تھا۔

"افوہ! یہ مصیبت بھی آج ہی آنی تھی۔ اِتنی گرمی ہے۔ اب آدھ گھنٹا اور جلنا پڑے گا" ذیشان نے کہا۔

"یار، مجھے تو پیاس لگ رہی ہے۔ آؤ، شربت پیتے ہیں" اسد نے کہا اور چاروں سڑک کے نکڑ پر کھڑے شربت والے کی طرف بڑھے۔ اُس کی ریڑھی پر خاصا رش تھا۔ وہ اپنا اپنا گلاس لے کر قریب ہی، بینک کی سیڑھیوں پر، بیٹھ گئے۔ چند لمحوں بعد اُن کے سامنے ایک گاڑی رُکی جس میں بیٹھے ہوئے آدمیوں نے سر اور مُنہ ڈھانپ رکھے تھے۔ ڈرائیور گاڑی میں بیٹھا رہا اور باقی چاروں باہر نکل کر بینک کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ ڈرائیور نے گاڑی تھوڑی دُور لے جاکر کھڑی کر دی۔

"گاڑی میں بیٹھ کر مُنہ اور سر ڈھانپنے کی بھلا کیا تُک ہے؟" فہیم نے کہا۔

"کہیں کوئی گڑ بڑ نہ ہو۔ ہو سکتا ہے یہ ڈاکو ہوں۔ ویسے ایک کے ہاتھ میں بیگ بھی تھا" فہیم نے شک کا اظہار کیا۔

"کیا خیال ہے؟ چل کر دیکھیں؟" فرخ نے پوچھا۔

"چھوڑو بھی۔ اُنہوں نے گرمی سے بچنے کے لیے مُنہ

ڈھانپا ہوگا اور تم نے اُن کو ڈاکو بنادیا۔ چلو، بس کا پہیّا بدل گیا ہوگا" ذیشان نے کہا۔

"نہیں، بھئی۔ پتا کیے بغیر ہم نہیں جائیں گے۔ اگر وہ سچ مچ ڈاکو ہوئے اور بینک لُٹ گیا تو ہمیں بعد میں افسوس ہوگا" فہیم نے فرخ کا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔

"اگر وہ واقعی ڈاکو ہوئے اور اندر گولی چلی اور ہم میں سے کسی کے لگ گئی تو ہمارے گھر والوں کو اِس سے بھی زیادہ افسوس ہوگا" اسد نے کہا۔

"ویسے بھی ہم چار لڑکے کر ہی کیا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے، وہ لوگ تو خطرناک مُجرِم ہوں گے، اور ہم تو جاسوسی کے میدان میں ابھی پیدا ہوئے ہیں۔ فی الحال کوئی چور ہی پکڑ لیں تو بڑی بات ہے۔ ڈاکوؤں کو پکڑنا ہمارے بس سے باہر ہے۔"

"بے چارے لوگوں کی ساری پونجی ڈاکو لے جائیں گے۔ یہ ظُلم ہم سے نہیں دیکھا جائے گا" فرخ نے کہا۔

"تو ہم کہاں دیکھ رہے ہوں گے؟ ہم تو آرام سے گھر بیٹھے ہوں گے" ذیشان نے لاپروائی سے کہا۔

"اگر آرام اِتنا ہی پیارا ہے تو تم کر چکے... جاسوسی۔ پہلے تو کہتے تھے، یہ کریں گے، وہ کریں گے۔ اب موقع مل رہا ہے تو بھاگنے کی پڑی ہے۔ فہیم نے لتاڑا "ہم تو بینک کے اندر ضرور جائیں گے۔ تم گھر جانا چاہو تو شوق سے چلے جاؤ۔"

"اب تمہیں ڈاکوؤں کے نرغے میں چھوڑ کر تو نہیں جاسکتے ناں" ذی شان نے مسکرا کر کہا۔

"ہم چاروں کا اندر جانا ٹھیک نہیں۔ میں اور فرخ اندر جاتے ہیں اور تم دونوں باہر رہ کر ہمارا اِنتظار کرو۔ اگر ہم پندرہ مِنٹ تک واپس نہ آئے تو تم پولیس کو بُلالانا" فہیم نے کہا اور فرخ کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیاں چڑھنے لگا "اور ہاں گاڑی پر بھی نظر رکھنا" جاتے جاتے فہیم بولا۔

دس مِنٹ گزر گئے اور فہیم اور فرخ نہ آئے تو ذیشان بولا "یار، مجھے بڑی گھبراہٹ ہورہی ہے۔ اندر جاکر نہ دیکھوں کہ کیا ہورہا ہے؟"

"اندر لڈّو بٹ رہے ہوں گے۔ جاؤ، دو چار تم بھی لے لو" اسد نے بِھنّا کر کہا۔

فرخ اور فہیم بینک کے اندر داخل ہوئے تو دروازے کے پاس گن مین چوکس بیٹھا تھا۔ اُس کے قریب ایک شخص سر جُھکائے سِگرٹ سُلگا رہا تھا۔ دونوں آگے بڑھے۔ سامنے مُختلف کاؤنٹر تھے اور اُن سے پرے تین کمرے نظر آرہے تھے۔ اُس وقت بینک کا ٹائم ختم ہوگیا تھا، اِس لیے رش کم تھا۔ لیکن وہ مشکوک آدمی کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

"یار، وہ تو ایسے غائب ہوگئے جیسے تمہارے سر سے سینگ" فہیم نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

"اور تمہارے جیسوں کے سر پر ویسے ہی سینگ نہیں ہوتے" فرخ نے جوابی کارروائی کی۔

"وہ سامنے منیجر کا کمرا ہے۔ چلو، اُدھر چل کر دیکھتے ہیں" فرخ نے سامنے دروازے کی طرف اِشارہ کیا۔

"پاگل ہوگئے ہو؟ منیجر سے کیا کہو گے جاکر؟ واپس چلو۔ کوئی ڈاکو واکو نہیں ہے۔" فہیم نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر یہ کہا تھا کہ منیجر کے کمرے کا دروازہ کُھلا اور اندر سے ایک آدمی ہاتھ اُٹھائے ہوئے نکلا۔ اُس کے پیچھے ایک اور آدمی تھا، جس کے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ آگے والے آدمی کو دھکّا دے کر آگے بڑھا رہا تھا۔

فہیم اور فرخ نے گن مین کی طرف دیکھا۔ اُس کے سر پر وہی آدمی پستول تانے کھڑا تھا جو کچھ دیر پہلے سِگرٹ سُلگا رہا تھا۔ ایک ڈاکو کاؤنٹر کے پیچھے کلاشنی کوف لیے کھڑا تھا۔

"سب لوگ ایک طرف ہوکر قطار بنالیں۔ کسی کو کچھ نہیں کہا جائے گا" کلاشنکوف والے نے کہا۔ سب لوگ قطار بناکر دیوار کی طرف مُنہ کیے، ہاتھ اُٹھائے کھڑے ہوگئے۔ ڈاکوؤں کا ایک ساتھی کیشیر کی دراز خالی کرنے لگا۔

"یار، پندرہ مِنٹ گزر چکے ہیں۔ اب وہ دونوں پولیس کو بُلانے چلے گئے ہوں گے۔ کہیں دیر نہ ہوجائے" فہیم نے ہاتھ اُٹھائے ہوئے فرخ کے کان میں سرگوشی کی۔

وہ دیوار کی طرف مُنہ کیے کھڑے تھے، اِس لیے اُنہیں

ڈاکوؤں کو دیکھنے کا زیادہ موقع نہیں ملا تھا۔ ایک ایک مِنٹ اُن پر بھاری گزُر رہا تھا۔

"میرے تو بازو تھک گئے ہیں۔ اب کیا کروں؟" فرُخ نے آہستہ سے کہا۔

"بازو نیچے کرلو۔ ہمیشہ کے لِیے آرام مِل جائے گا" فہیم نے جواب دیا۔

"سب لوگ ایک ایک کرکے سامنے والے کمرے میں جاؤ۔ کوئی چالاکی کی کوشش نہ کرے۔ اندر بھی ہمارا ایک ساتھی موجود ہے" کلاشنکوف والے نے کہا۔

جب پندرہ مِنٹ گزُر گئے اور فہیم اور فرُخ واپس نہ آئے تو ذی شان اور اسد بہُت پریشان ہوئے۔

"اب کیا کریں؟" ذیشان نے کہا۔

"پولیس کو بُلاتے ہیں، اور کیا کریں گے؟" اسد نے کہا "تم چھُپتے چھُپاتے گاڑی کے پیچھے جاؤ اور اُس کے ٹائر پنکچر کردو تاکہ وہ لوگ فرار نہ ہوسکیں۔ میں پولیس کو بُلانے جاتا ہوں" اسد نے کہا اور پولیس کو خبر کرنے دوڑا۔ نزدیک ہی ایک پولیس چوکی تھی۔ اسد ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوا۔ وہاں دو پولیس والے موجود تھے۔

"کیا بات ہے؟ کہاں گھُسے آرہے ہو؟" کرُسی پر بیٹھے ہوئے پولیس والے نے کہا۔ دوسرا پولیس والا میز پر ٹانگیں رکھے شاید سو رہا تھا۔

"وہ سر، اُدھر جو بینک ہے، اُس کے اندر ڈاکو گھُسے ہوئے ہیں" اسد نے ہمّت کرکے کہا۔

"کیا ڈاکو تمہیں بتاکر وہاں گھُسے ہیں؟" اُس نے پوچھا۔

"سر، میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میرے تین ساتھی اور بھی ہیں۔ ہم چاروں نے چار آدمیوں کو مُنہ پر ڈھاٹے باندھے بینک کے اندر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ میرے دو ساتھی اندر گئے تھے کہ پتا کریں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ ہم پندرہ مِنٹ تک واپس نہ آئے تو تم پولیس کو لے آنا۔ اب تو آدھا گھنٹا ہونے والا ہے" اسد نے پوری تفصیل بتائی۔

"پولیس تو جیسے فارغ بیٹھی ہے، تم جیسے بے وقوفوں کے ساتھ جانے کے لِیے۔ تمہارے ساتھی اندر ٹھنڈ میں بیٹھ گئے ہوں گے۔ اور تم اِس گرمی میں ہمیں تنگ کرنے آگئے ہو۔ جاؤ، بھاگو یہاں سے" اُس نے بڑبڑاتے ہوئے اسد کو باہر جانے کا اِشارہ کیا۔

اُن کی باتوں سے دوسرے پولیس والے کی نیند میں خلل پڑا تو وہ بھی اُٹھ بیٹھا "کیا بات ہے؟ یہ بچّو لنگڑا یہاں کیا کررہا ہے" اُس نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

"یہ ڈاکے کی اِطلّاع دینے آیا ہے" پہلے پولیس والے نے مذاق اُڑانے والے لہجے میں کہا۔ اُسی وقت ایک اور پولیس والا اندر داخِل ہوا۔ وہ اُن کا افسر معلوم ہوتا تھا۔

"کیا بات ہے، بشیر؟ یہ لڑکا یہاں کیا کررہا ہے؟" اُس نے نرمی سے پُوچھا۔

اسد کو کچھ حوصلہ ہوا۔ اُس نے جلدی جلدی ساری بات دُہرائی۔ پولیس افسر نے اُس کی بات دھیان سے سُنی اور وائرلیس پر پولیس کے آدمیوں کو فورًا آنے کی ہدایت کی۔

"سر، جلدی کریں۔کہیں وہ فرار نہ ہوجائیں" اسد نے بے چینی سے کہا۔

"گھبراؤ نہیں۔وہ لوگ اِتنی جلدی فارِغ نہیں ہوں گے۔ میں نے سادہ کپڑوں والے پولیس والوں کو بُلایا ہے۔ اگر ہم لوگ وردی میں وہاں گئے تو گاڑی میں بیٹھا ہُوا ڈاکو اپنے ساتھیوں کو خبردار کردے گا۔ ہم اُنھیں اندر جاکر پکڑنا نہیں چاہتے۔ اِس طرح خون خرابے کا اندیشہ ہے۔ ہم اُنھیں اُس وقت پکڑیں گے جب وہ باہر آئیں گے" پولیس افسر نے اسد کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

جلد ہی سادہ کپڑوں والی پولیس وہاں پہنچ گئی۔ ذیشان گاڑی پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ اسد نے اُسے اِشارہ کرکے بُلایا۔ پولیس کا ایک آدمی گاڑی کے قریب دوسری طرف مُنہ کرکے کھڑا ہوگیا۔ تین پولیس والے بینک کی سیڑھیاں چڑھ کر گیٹ کی طرف بڑھے۔ گاڑی کے ڈرائیور نے یہ دیکھا تو گھبرا گیا۔ اُس نے جُوں ہی دروازہ کھولا، پاس کھڑے پولیس والے نے اُس کے سر پر ایک ہاتھ رسید کیا اور وہ گر گیا۔

اُدھر پولیس کے تین سپاہی بینک کے دروازے کے پاس یوں کھڑے تھے جیسے گرمی سے بچنے کے لِیے آئے ہوں۔ جوں ہی دروازہ کھُلا اور تین آدمی بیگ لِیے باہر آئے، ایک پولیس والے نے اپنی ٹانگ آگے کردی۔ ڈاکو ویسے ہی گھبرائے ہوئے تھے۔ اڑنگا لگا تو دو سیڑھیوں پر گرگئے۔ تیسرے کے سر پر ایک پولیس والے نے کراٹے کا وار کیا۔ سب قابو میں آگئے۔

اگلے دن چاروں ہیرو اسد کے گھر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ لوگوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ وہ اِس واقعے کی تفصیل اُن کے مُنہ سے سُننا چاہتے تھے۔

"خدا کے لِیے اب بس کریں۔ 360 مرتبہ سُنا چکے ہیں" اسد نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

****

مکڑی کی کتنی آنکھیں ہوتی ہیں؟

اکثر مکڑیوں کی 8 آنکھیں ہوتی ہیں۔ لیکن 6 آنکھوں، 4 آنکھوں اور 2 آنکھوں والی مکڑیاں بھی ہوتی ہیں۔ جو مکڑیاں اندھیرے غاروں میں رہتی ہیں، اُن کی کوئی آنکھ نہیں ہوتی۔

مکڑی کی آنکھیں اُس کے سر پر، سر کے اگلے حصّے کے قریب، ہوتی ہیں۔ اِتنی آنکھوں کے باوجود وہ صرف چند اِنچ دُور کی چیزیں ہی دیکھ سکتی ہے۔ لیکن اُس کی چھُونے کی حِس (حِسِ لامِسہ) اور چکھنے کی حِس (حِسِ ذائقہ) بہُت تیز ہوتی ہے۔

مکڑی کے جسم پر خاص قسم کے بال ہوتے ہیں، جن میں اعصاب ہوتے ہیں۔ یہ اعصاب کان، ناک اور زبان کا کام دیتے ہیں۔ اِنھی کی مدد سے اُسے خطرے کا اِحساس ہوتا ہے، اور اِنھی کے ذریعے وہ اپنا شکار تلاش کرتی ہے۔

قتیل شفائی

Sharjeel Ahmed

سُرخ بتّی

اِتنی سی بات میں ہے، ہر شخص کی بھلائی
بتّی جو سُرخ دیکھو، رُک جاؤ، میرے بھائی

ٹریفک کا ہر اِشارا
ہے راہ بر تمہارا
اِس کے اُصول سارے
ہم درد ہیں تمہارے

اچّھی جو بات ہے وہ، ہم نے تمہیں بتائی
بتّی جو سُرخ دیکھو، رُک جاؤ، میرے بھائی

○

سائیکل ہو یا اِسکوٹر
تانگہ ہو، چاہے موٹر
یہ فرض ہے تمہارا
کاٹو نہ تم اِشارا

قانُون توڑ کر تم، لیتے ہو کیوں بُرائی؟
بتّی جو سُرخ دیکھو، رُک جاؤ، میرے بھائی

○

جتنے یہ قاعدے ہیں
سَو اِن میں فائدے ہیں
یہ قاعدے نبھاؤ
اور فائدے اُٹھاؤ

یہ کام ہے وہ جس میں، پیسہ لگے نہ پائی
بتّی جو سُرخ دیکھو، رُک جاؤ، میرے بھائی

تحریر: ایڈگر ویلس
ترجمہ: ڈاکٹر رؤف پاریکھ

Sharjeel Ahmed

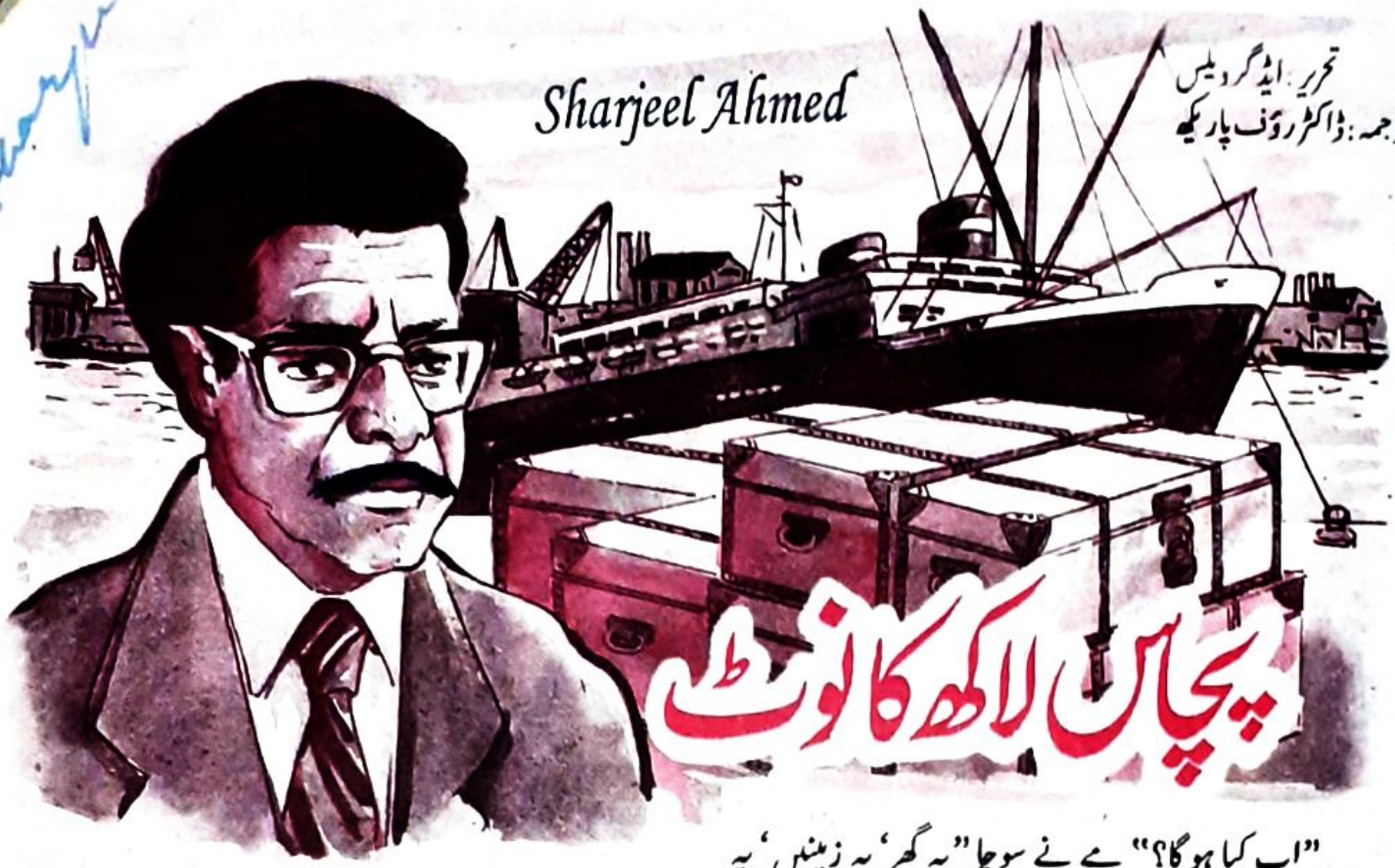

پچاس لاکھ کا نوٹ

"اب کیا ہوگا؟" مے نے سوچا "یہ گھر' یہ زمینیں' یہ گھوڑے اور گاڑیاں' کیا یہ سب کچھ بیچنا پڑے گا؟"

مُعاملہ ہی کچھ ایسا تھا۔ اُس کے والِد نے اُسے بتایا تھا کہ اُن کے کاروبار میں بہت بڑا نقصان ہوگیا ہے اور اب اُنہیں اپنی ہر چیز بیچنی پڑے گی۔ اُس کا خیال تھا کہ اِس قسم کی باتیں صرف قصّے کہانیوں میں ہُوا کرتی ہیں' لیکن اب اُسے لگ رہا تھا کہ اُس کے والِد کی تمام دولت قصّے کہانیوں کی بات ہو جائے گی۔ وہ سُلگتی رہی اور سوچتی رہی۔ آخر وہ اپنے والِد سے کُھل کر بات کرنے کا اِرادہ کر کے اُن کے کمرے کی طرف بڑھی' لیکن وہ باہر برآمدے ہی میں اُسے مل گئے۔ وہ اپنی پسندیدہ آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مے کے قدموں کی آہٹ سُن کر اُنہوں نے سر اُٹھایا اور اُسے دیکھ کر ایک پھیکی سی مسکراہٹ اُن کے چہرے پر اُبھری۔

مے نے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولی "ڈیڈی' کچھ بتائیے تو سہی کہ کیا ہُوا اور کیسے ہُوا؟ آخر پچاس لاکھ کے نوٹ غائب کہاں ہوگئے؟"

"لو' اب ہماری بیٹی بھی کاروبار کی فکر کر رہی ہے" اُس کے والِد نے کہا۔ اُن کا نام جان انٹرم تھا۔ وہ ایک دولت مند تاجِر تھے اور مُختلِف ملکوں کے کرنسی نوٹوں کی خرید و فروخت کرتے تھے۔

"میں کاروباری مُعاملات تو نہیں سمجھتی' لیکن مجھے کچھ بتائیے تو سہی۔ شاید میں کچھ مدد کر سکوں۔ اب میں اِتنی چھوٹی بھی نہیں" مے نے کہا۔

"بیٹھو" اُنہوں نے دوسری کرسی کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ مُعاملہ اِس مہینے کی اٹھارہ تاریخ کو شروع ہوا جب "پرنس" نامی بحری جہاز یہاں نیو یارک سے انگلستان روانہ ہونے والا تھا۔ یہ جہاز دو بھائیوں' فرانسِس اور اِمتھ کا ہے۔ تم فرانسِس اور اِمتھ کو جانتی ہو؟"

"یہ جو ہمارے رشتے دار ہیں؟" مے نے پوچھا۔

"بالکُل وہی" مسٹر جان نے کسی قدر افسوس کے ساتھ کہا' اور پھر بولے "بینک آف انگلینڈ سے میرا ایک کاروباری مُعاہدہ ہوا تھا اور بینک نے مجھ سے پچاس لاکھ ڈالر کے مختلف مُلکوں کے نوٹ خریدے تھے۔ یہ نوٹ میں نے لوہے کے چھ صندوقوں میں بھرے اور اُن صندوقوں پر دھات کے ایسے ٹانکے لگائے کہ وہ بالکُل بند ہوگئے۔ یہ میں نے اِس لیے کیا کہ اُن میں ہوا یا پانی نہ جا سکے۔ پھر اُن کو

لکڑی کے صندوقوں میں بند کروا کے بحری جہاز پرنس پر لاد دیا گیا۔ بحری جہازوں میں ایسی قیمتی چیزیں اور سامان لے جانے کے لیے ایک خاص کمرا ہوتا ہے، جسے اِسٹرانگ رُوم کہتے ہیں۔ اِس کمرے کا ایک دروازہ برابر والے کیبن میں کُھلتا ہے۔ اِس کیبن میں ایک ملّاح کو اِن چیزوں کی حفاظت کے لیے رکھا جاتا ہے۔ تو بھئی، یہ چھ صندوق، جن میں پچاس لاکھ کے نوٹ تھے، اُس جہاز کے اِسٹرانگ روم میں رکھ دیے گئے۔ اُس کی چابی فرانسس کے پاس تھی، اور چُوں کہ مُعاملہ بہت بڑی رقم کا تھا، لہٰذا اُس نے فیصلہ کیا کہ جب تک جہاز روانہ نہیں ہو جائے گا، وہ جہاز پر ہی رہے گا۔ چُناں چہ اُس نے ایسا ہی کیا، یہاں تک کہ رات کو سویا بھی اِسٹرانگ روم کے برابر والے کیبن میں۔ بلکہ جب دن کے وقت وہ کسی کام سے اِدھر اُدھر گیا تو اپنے ذاتی مُلازِم ڈیوڈ کو اِسٹرانگ روم کے برابر والے کیبن میں بٹھا گیا"۔

"ڈیڈی، نوٹوں کا کیا بنا؟ یہ بتایئے؟" مے نے بے تابی سے کہا۔

"بتاتا ہوں، بیٹی۔ میں ساری بات تفصیل سے اِس لیے بتا رہا ہوں کہ پورا مُعاملہ تمہاری سمجھ میں آجائے اور تم اِس مُعمّے کو حل کرنے میں میری کچھ مدد کر سکو۔ ہاں تو، اٹھارہ تاریخ کو صندوق جہاز پر لاد دیے گئے اور اِسٹرانگ روم میں تالا لگا دیا گیا۔ اُس کی چابی فرانسس کے پاس تھی۔ رات کو فرانسس اِسٹرانگ روم کے برابر والے کیبن میں سویا، اور صبح یعنی 19 تاریخ کو جب جہاز کی روانگی کا وقت ہُوا تو اُس نے جہاز کے قانون کے مُطابق، اِن چھ صندوقوں کے کاغذات جہاز کے "پرسر" کو دے دیے"۔ اِتنا کہہ کر وہ رُک گئے اور پھر کچھ سوچ کر بولے "پرسر جہاز کا ایک افسر ہوتا ہے جو تمام سامان کے اور مسافروں کے کاغذات کا خیال رکھتا ہے"۔

"آگے بتایئے۔ مجھے معلوم ہے کہ پرسر کسے کہتے ہیں" مے نے جلدی سے کہا۔

"ہاں تو، فرانسس نے کاغذات پرسر کے حوالے کر دیے، اور اُس سے کہا کہ یہ چھ صندوق بہت قیمتی ہیں۔ اِن میں پچاس لاکھ کے نوٹ ہیں۔ اب اِن کو اِنگلستان تک حفاظت سے پہنچانا آپ کی ذمّے داری ہے۔ آپ اِطمینان کر لیجیے کہ اِسٹرانگ روم میں صندوق موجود ہیں۔ یہ اِسٹرانگ روم کی چابی ہے۔ میں اِسٹرانگ روم کا دروازہ کھولتا ہوں"۔ یہ کہہ کر فرانسس نے تالے میں چابی گھُمائی اور جب اِسٹرانگ روم کا دروازہ کُھلا تو..... تو وہاں کچھ بھی نہ تھا!"

"کچھ بھی نہ تھا؟ کیا اِسٹرانگ روم میں کوئی کھڑکی تھی؟" مے نے پوچھا۔

"کھڑکی کہو یا کچھ اور، اصل میں اُس کو پورٹ ہول کہتے ہیں۔ یہ ایک گول روشن دان سا ہوتا ہے اور تمام بحری جہازوں میں اِس قسم کے پورٹ ہول ہوتے ہیں۔ یہ پورٹ ہول جس رُخ پر تھا، اُس طرف پانی تھا اور اُس میں سے کوئی چیز گرتی تو سیدھی پانی میں جاتی۔ بہرحال، فرانسس نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ سارا جہاز دو دفعہ چھان مارا گیا۔ ہر جگہ دیکھ لی گئی۔ لیکن کہیں صندوقوں کا نام نشان تک نہ تھا۔ کسی نے کسی کو جہاز سے کوئی چیز لے جاتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا۔ چُوں کہ صبح جہاز کو روانہ ہونا تھا، اِس لیے ساری رات اُس پر سامان لادا جاتا رہا تھا اور جہاز کے افسر اور مزدور وہاں موجود رہے تھے۔ ظاہر ہے، اگر کوئی چھ کیا ایک صندوق بھی لے کر جاتا تو جہاز سے اُترنے سے پہلے ہی اُسے پکڑ لیا جاتا"۔

"تو پھر صندوق گئے کہاں؟" مے نے پوچھا۔

"خدا ہی جانے--- خیر، اُسی وقت پولیس بُلائی گئی اور اُس نے غوطہ خور بھی پانی میں اُتارے، لیکن کچھ پتا نہ چلا" مسٹر جان نے افسوس سے کہا "اب خیال آتا ہے کہ اِتنی بڑی رقم ایک ساتھ بھیجنا حماقت تھی"۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ دونوں باپ بیٹی اپنی اپنی سوچوں میں گُم تھے۔ آخر مے نے کہا "ڈیڈی، آپ بینٹ سے کیوں نہیں بات کرتے؟"

"بینٹ؟ وہ شوقیہ سُراغ رساں؟" جان نے حیرت سے

کہا "وہ بھلا کیا کرے گا؟ پولیس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ ہمارا رشتے دار ہے اور میں مانتا ہوں کہ وہ بہت ذہین ہے لیکن....."۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں' ڈیڈی۔ میرا خیال ہے' وہی ہماری کچھ نہ کچھ مدد کر سکتا ہے۔ میں اُسے فون کر کے بُلا رہی ہوں"۔

بینٹ کے آنے پر مے نے اُسے ساری تفصیل بتائی۔ مسٹر جان نے اُسے بتایا کہ جہاز ابھی تک بندرگاہ پر کھڑا ہے اور پولیس اُسے جانے کی اِجازت نہیں دے رہی۔ بینٹ کچھ دیر بعد بندرگاہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ چند گھنٹوں بعد جب وہ واپس آیا تو مسٹر جان نے اُس سے مسکراتے ہوئے کہا "ہاں بھئی' کیا پتا چلا؟" لیکن اُن کے لہجے میں ایک عجیب سی بے یقینی تھی۔

"بہت کچھ" بینٹ نے بتانا شروع کیا "پہلی عجیب بات تو یہ معلوم ہوئی کہ جس کیبن میں فرانسس سویا تھا' اُس میں سے چھ تولیے غائب ہیں"۔

"تولیوں کا بھلا اِس کیس سے کیا تعلّق؟" مسٹر جان نے کہا۔

"بہت گہرا تعلّق ہے۔ ابھی آپ کو بتاتا ہوں۔ چھ صندوق اور چھ تولیے۔ دوسری بات یہ کہ جہاز کا ایک ملازم اُس رات کیبن کے باہر موجود تھا۔ اُسے حفاظت کے خیال سے وہاں بٹھایا گیا تھا۔ میں نے اُس سے بات کی۔ اُس کا کہنا ہے کہ اُس رات وہ ایک اِسٹول پر کیبن کے باہر بیٹھا تھا اور اُسے اُونگھ آ رہی تھی۔ لیکن اُسے اچھی طرح یاد ہے کہ اُس نے آدھی رات کو کریک کریک کی آوازیں سُنی تھیں۔ اُس کا کہنا ہے کہ یہ آوازیں ایسی تھیں جیسے کوئی ٹائم پیس میں چابی بھر رہا ہو۔ اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اُس نے یہ آواز چھ دفعہ سُنی!"

"چھ دفعہ؟" مے نے حیرت سے کہا۔

"ہاں' چھ دفعہ۔ چھ صندوق' چھ تولیے' چھ آوازیں" بینٹ نے کہا "دوسری بات یہ کہ وہ صندوق خاصے وزنی تھے۔ کوئی شخص اُنہیں اِتنی آسانی سے اُٹھا کر زیادہ دُور نہیں لے جا سکتا۔ اور پھر جہاز پر اور بندرگاہ پر بھی خاصے لوگ موجود تھے۔ لہٰذا یہ بات یقینی ہے کہ صندوق جہاز پر سے نہیں اُتارے گئے۔ میں نے پورٹ ہول کا مُعاینہ کیا ہے۔ وہ اِتنا بڑا ضرور ہے کہ اُس میں سے وہ صندوق ایک ایک کر کے نکل جائیں۔ لیکن اُس کے فریم پر لوہے کی پتری لگی ہے۔ اگر صندوق اُس میں سے گزارے جاتے تو اُن کی لکڑی کے پتری پر رگڑ کھانے سے پتری پر نشان ضرور پڑتے۔ مگر اُس پر کوئی نشان نہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ جس کسی نے بھی صندوق پورٹ ہول سے نیچے پھینکے' اُس نے اُن پر پہلے تولیہ لپیٹا تھا"۔

"تمہارا مطلب ہے' صندوق پورٹ ہول سے پانی میں پھینکے گئے؟" مسٹر جان نے کہا۔

"بالکل، جناب"، بینٹ نے جواب دیا۔

"لیکن پولیس کے غوطہ خوروں نے جہاز کے اِردگِرد کے تمام عِلاقے میں سمندر کی تہ کھنگال ڈالی تھی۔ اُنہیں کوئی صندوق نہیں ملا" مسٹر جان نے کہا۔

"آپ بھول رہے ہیں کہ صندوق آدھی رات کے لگ بھگ پانی میں پھینکے گئے اور پولیس صبح کے وقت آئی۔ مُجرموں کے پاس صندوق سمندر کی تہ سے نکال کر لے جانے کا خاصا وقت تھا اور اُنہوں نے ایسا ہی کیا" بینٹ نے اِطمینان سے جواب دیا۔

"لیکن یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟" ے نے پوچھا "اور پھر سمندر کی تہ میں صندوق تلاش کرنا اور اُنہیں نکالنا اِتنا آسان تو نہیں"۔

"اصُولاً تو فرانِسس ہی کو اِس ساری گڑبڑ کا ذمّے دار ٹھہرایا جانا چاہیے۔ کیوں کہ چابی اُسی کے پاس تھی اور......" بینٹ نے کہا۔

"تم جانتے ہو کہ وہ میرا رشتے دار ہے اور تمہارا بھی۔ اِس لیے میں اُس پر کسی قِسم کا اِلزام لگانا مُناسِب نہیں سمجھتا" مسٹر جان نے بینٹ کی بات کاٹ کر کہا۔

"بہرحال، میرا اُس سے ملنا ضروری ہے، اور میں وہیں جا رہا ہوں" یہ کہہ کر بینٹ چلا گیا۔

فرانِسس اور اِسمتھ ایک بڑے سے گھر میں رہتے تھے۔ دونوں میں سے کسی نے بھی شادی نہیں کی تھی۔ والِد کے اِنتقال کے بعد اُنہیں خاصی جائیداد وِرثے میں ملی تھی۔ لیکن اپنی نا اہلی کی وجہ سے اُنہوں نے ساری جائیداد ٹھکانے لگا دی۔ یہاں تک کہ اُن کے بحری جہازوں کی کمپنی میں بھی صرف دو جہاز رہ گئے تھے۔ بینٹ جب اُن کے گھر پہنچا تو دونوں بھائی گھر پر ہی تھے۔ بینٹ کو دیکھ کر اُنہوں نے خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ اِسمتھ تو گاڑی میں بیٹھ کر کہیں چلا گیا۔

"کتنی عجیب بات ہے کہ رشتے دار ہونے کے باوجود ہم لوگ ایک دوسرے سے برسوں نہیں مِل پاتے" بینٹ نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا "میں نے سوچا تم لوگوں سے مِل لُوں اور تمہارا گھر بھی دیکھ لُوں"۔

"ہاں، ہاں۔ کیوں نہیں" فرانِسس نے کہا۔

"اور میں نے سُنا ہے کہ تم لوگوں کا کاروبار خاصے نقصان میں جا رہا ہے اور تم اپنے جہاز اور یہ مکان وغیرہ فروخت کر کے فرانس جانا چاہتے ہو" بینٹ نے کہا۔

"لگتا ہے، تم ہمارے بارے میں خاصی چھان بین کر چکے ہو" فرانسس نے چُبھتے ہوئے لہجے میں کہا "ویسے گھر تم ضرور دیکھو۔ لیکن یہ کُرید اچھّی نہیں"۔

"ارے، تم تو بِلاوجہ ناراض ہو رہے ہو۔ دراصل میرے ایک دوست کے والد ایک اچھّا مکان خریدنا چاہ رہے ہیں۔ اُنہیں جائیداد کی خرید و فروخت کرنے والی ایک کمپنی نے تمہارا نام اور پتا بتایا۔ مجھے پتا چلا تو میں نے کہا کہ یہ تو میرے رشتے دار ہیں۔ میں ایک نظر پہلے مکان پر ڈال لوں۔ پھر آپ کو بتاؤں گا کہ مکان کیسا ہے۔ اور شاید میرے رشتے دار آپ کو یہ مکان کچھ کم قیمت پر بھی دے دیں" بینٹ نے بات بنائی۔

فرانِسس بے دِلی سے اُٹھا اور اُسے مکان دِکھانے لگا۔ دونوں ایک ایسے کمرے میں پہنچے جو مُختلِف اوزاروں اور پُرزوں سے بھرا ہوا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" بینٹ نے حیرانی سے چاروں طرف دیکھا۔

"ارے بھئی، یہ اِسمتھ کا گودام ہے۔ وہ اِسے تجربہ گاہ کہتا ہے۔ کم بخت اچھّا خاصا سائنس دان ہے۔ اُلٹی سیدھی چیزیں بناتا رہتا ہے۔ بلکہ اُس نے ایک اِیجاد تو ایسی کی ہے جو پانی میں......" فرانِسس کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔

"ہاں، ہاں۔ کہو۔ پانی میں کیا؟" بینٹ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ میرا مطلب ہے، وہ... رقم جو اُس نے اِس اِیجاد میں لگائی تھی، وہ سب کی سب ڈوب گئی۔ بہُت نقصان ہوا" فرانِسس نے جلدی سے کہا۔

"وہ اِیجاد تھی کیا؟" بینٹ نے پوچھا۔

"خدا جانے۔ میں اِن سائنسی باتوں کو بھلا کیا سمجھوں" فرانسس نے بات بدلنے کی کوشش کی۔ لیکن بینٹ کو اندازہ ہو چکا تھا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ تب اُس کی نظر رنگ کے ایک ڈبّے پر پڑی جو حال ہی میں کھولا گیا تھا۔ کیوں کہ اُس کے ڈھکّن پر رنگ کے نشان تھے اور زیادہ پُرانے نہیں لگتے تھے۔ اِس ڈبے پر لکھا تھا "روشن رنگ"۔ بینٹ سوچ میں پڑ گیا۔

دو تین دن گزر گئے۔ کچھ نہ ہُوا۔ آخر مے نے اُکتا کر بینٹ کو فون کیا "کہاں ہو تم؟ نوٹوں کا کیا بنا؟ ڈیڈی بار بار پوچھ رہے ہیں"۔

"اچھا ہُوا تم نے فون کرلیا۔ میں تمہیں خوش خبری سُنانے ہی والا تھا" بینٹ نے کہا۔

"کیسی خوش خبری؟" مے کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔

"اپنے ڈیڈی سے کہہ دینا کہ صبح تک اُن کی پوری رقم اُن کے گھر پہنچ جائے گی" بینٹ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مذاق مت کرو۔ ہم بہت پریشان ہیں" مے بُرا مان کر بولی۔

"ارے، میں مذاق نہیں کر رہا۔ کل صبح دیکھ لینا۔ پوری بات کل صبح آکر ہی بتاؤں گا۔" یہ کہہ کر بینٹ نے فون رکھ دیا اور مے ہیلو ہیلو کرتی رہ گئی۔

اگلی صبح واقعی مسٹر جان انٹرم کے چھ صندوق، ایک ٹرک میں، اُن کے گھر پہنچ گئے۔ جب اُن کو کھول کر دیکھا گیا تو رقم پوری تھی۔ پورے پچاس لاکھ۔ اِتنے میں بینٹ آگیا۔ مسٹر جان نے اُسے سینے سے لگا لیا اور بولے "مُعاف کرنا۔ جب مے نے مجھ سے کہا کہ بینٹ کو اِس کیس کی تفتیش کرنے دیں تو میں نے تمہیں شوقیہ سُراغ رساں کہا تھا۔ تم تو چھپے رُستم نکلے۔ لیکن یہ قِصّہ کیا تھا؟"

بینٹ صوفے پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا "آپ وعدہ کیجیے کہ اِس کا ذکر کسی سے نہیں کریں گے اور پولیس میں بھی کیس ختم کروا دیں گے"۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن پتا تو چلے کہ ہُوا کیا تھا" مسٹر جان بولے۔

"میں نے فرانسس اور اِمتھ سے وعدہ کیا ہے کہ اُن کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوگی"۔

دونوں باپ بیٹی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا لیکن بولے کچھ نہیں۔ بینٹ بولا "دراصل یہ دونوں مالی اِعتبار سے بالکل تباہ ہو چکے ہیں۔ لاکھوں کا قرضہ ہے اِن پر، اور شاید جہاز بیچ کر بھی اِن کا قرض ادا نہ ہو۔ اِسی لیے انہوں نے پچاس لاکھ کی رقم ہتھیانے کا منصوبہ بنایا۔ اِمتھ بہت ذہین ہے۔ اُس نے ایک ایسا آلہ ایجاد کر لیا تھا جو پانی میں گھڑی کی طرح چلتا ہے۔ دراصل وہ پانی کا ٹائم بم ایجاد کرنے کی فکر میں تھا کہ اُس نے یہ چیز بنالی۔ اُس میں ایک گھڑی ہوتی ہے، جس کی سُوئی کو گھما کر آپ ٹائم پیس کی طرح کسی بھی وقت پر لگا سکتے ہیں۔ جب گھڑی کی سُوئیاں

اُس وقت پر پہنچتی ہیں تو اُس کا ایک خانہ کھٹاک سے کھلتا ہے اور اُس میں سے ایک کارک باہر نکلتا ہے۔ چُوں کہ کارک وزن میں ہلکا ہوتا ہے، اِس لیے خانے میں سے نکلتے ہی تیزی سے اُوپر اُٹھتا ہے اور پانی کی سطح پر پہنچ کر تیرنے لگتا ہے۔ اِس کارک سے ایک دھاگا بندھا ہوتا ہے جس کا دوسرا سِرا اُس آلے سے بندھا ہوتا ہے۔ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اُن دونوں نے اِس آلے کی مدد سے کس طرح صندوق پار کر لیے"۔

"یہ تو تم نے آلے کے بارے میں بتایا۔ صندوق کہاں غائب ہو گئے تھے؟" مسٹر جان نے پوچھا۔

"سیدھی سی بات ہے۔ فرانسس نے آدھی رات کے وقت اِسٹرانگ رُوم کھول کر صندوقوں پر تولیے لپیٹے اور ہر صندوق کے ساتھ ایک ایک آلہ لگا دیا۔ اِس کے بعد صندوقوں کو پورٹ ہول سے سمندر میں پھینک دیا۔ اُس نے گھڑیوں میں دو بجے کا وقت لگایا تھا اور اِس سے جو کریک کریک کی آواز پیدا ہوئی تھی، وہ کیبن کے باہر بیٹھے ہوئے آدمی نے سُنی تھی۔ خیر، صندوقوں کے پانی میں گرنے سے زیادہ شور نہیں ہُوا، کیوں کہ پورٹ ہول زیادہ اُونچائی پر نہیں تھا اور پھر اُس کا رُخ گودی کی طرف نہیں، سمندر کی طرف تھا۔ اِس لیے نہ کسی نے صندوق پانی میں گرتے دیکھے اور نہ چھپاکے کی آواز سُنی۔ اِمتھ کچھ دیر بعد کشتی لے کر آیا اور دو بجے کے قریب جہاز کے پاس پہنچا۔ دو بجتے ہی آلوں کے خانے کھُل گئے اور ایک ایک کر کے چھ کارک پانی کی سطح پر اُبھرے۔ اِن کارکوں پر اِمتھ نے روشن رنگ کر رکھا تھا۔"

"یہ روشن رنگ کیا چیز ہے؟" مے نے پوچھا۔

"روشن رنگ ایک خاص قسم کا رنگ ہے۔ جب اُس پر روشنی پڑتی ہے تو وہ چمکنے لگتا ہے۔ آپ نے بعض گاڑیوں پر روشن رنگ کے اِسٹکر لگے دیکھے ہوں گے۔ فٹ پاتھوں کے کناروں پر بھی یہ رنگ لگا ہوتا ہے۔ رات کے اندھیرے میں اِن پر روشنی پڑتی ہے تو ان کے چمکنے سے گاڑیاں چلانے والوں کو آسانی ہو جاتی ہے۔ لو جناب، جب اِمتھ کشتی لے کر آیا تو ٹارچ کی روشنی میں اُسے چھ کارک دُور ہی سے نظر آ گئے جو دھاگے کے ذریعے صندوقوں سے بندھے ہوئے تھے اور پانی کی سطح پر تیر رہے تھے۔ اُس نے یہ صندوق پانی سے نکال لیے اور اُنہیں کشتی میں رکھ کر لے گیا"۔

"لیکن تم نے اُنہیں پکڑا کیسے؟" مسٹر جان نے پوچھا۔

"جب میں نے کریک کریک کی آوازوں کی بات سُنی تو شہر کے گھڑی سازوں سے مِلا۔ اُنہوں نے مجھے بتایا کہ یہ مخصوص قسم کے ٹائم پیس پر خاص وقت لگانے کی آواز ہو سکتی ہے۔ پانی کے ایسے آلے کسی زمانے میں فوجی لوگ مُختلف تجربوں کے لیے اِستعمال کرتے تھے۔ کبھی ٹائم بم بنانے کے لیے اور کبھی چیزیں پانی میں چُھپا کر دو تین گھنٹوں کے بعد نکالنے کے لیے۔ اِس کے بعد میں نے فرانسس کے بارے میں تحقیق کی۔ کیوں کہ میرا شُبہ اُسی پر تھا۔ مجھے پتا چلا کہ یہ دونوں بھائی کنگال ہو چکے ہیں اور مکان بیچ کر ملک چھوڑنے کے چکّر میں ہیں۔ اِس سے میرا شُبہ بڑھ گیا۔ میں نے اُن کے گھر میں روشن رنگ کا تازہ کُھلا ہوا ڈبّا دیکھا اور فرانسس کے مُنہ سے نکل گیا کہ اِمتھ نے پانی کی کوئی چیز ایجاد کی ہے۔ میں نے اِس ایجاد کے بارے میں تحقیق کی تو پتا چلا کہ اِمتھ نے اِسے اپنے نام سے پیٹنٹ کرانے کے لیے حکومت کے محکمے کو درخواست دے رکھی ہے۔ اُس نے درخواست کے ساتھ ایجاد کی پوری تفصیل بھی لکھی تھی۔ اُسے پڑھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کام اِن دونوں بھائیوں ہی کا ہے۔ میں نے اُنہیں جب ساری بات بتائی تو پہلے تو اُنہوں نے ماننے سے اِنکار کر دیا، لیکن جب میں نے پولیس میں جانے کی دھمکی دی تو دونوں گڑگڑانے لگے اور پوری رقم واپس کر دی۔ یہ تھا پورا قصّہ۔ آپ کو اپنی پچاس لاکھ کی رقم مُبارک ہو!"۔

Sharjeel Ahmed

حج اور عیدُ الاضحیٰ

ڈاکٹر عبدالرؤف

اِس دفعہ بچوں کے لیے درسِ قرآن کے لیے ہم نے حج اور عید کا اہم موضوع مُنتخب کیا ہے۔ حج کی وضاحت کے لیے قرآنِ حکیم کی تیسری سورت کی آیت نمبر97 کے یہ درمیانی الفاظ مُلاحظہ ہوں۔

أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ ○

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ○

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ

ترجمہ :لوگوں پر اللہ تعالیٰ کے لیے حجِ بیتُ اللہ فرض ہے۔ قرآنِ کریم میں کئی اور جگہوں پر بھی حج کی اہمیّت واضح کی گئی ہے۔ اِس کے عِلاوہ ہمارے پیارے نبی حضرت محمدّ ﷺ کی مُتعدّد حدیثوں میں بھی اِس موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

زندگی میں کم از کم ایک بار حج کرنا ضروری ہے۔ حج صرف ایسے بالغ مردوں اور عورتوں پر فرض ہے جو صحّت مند ہوں اور اُس کے تمام اِخراجات برداشت کرسکتے ہوں۔ بچّوں پر حج فرض نہیں۔ مگر اگر وہ اپنے والِدَین کے ہمراہ چلے جائیں تو کوئی حرج نہیں۔

سعودی عرب پہنچ کر حج کی پانچ روزہ تقریبوں میں پوری شمولیت سے حج کا فریضہ ادا ہوتا ہے۔ یہ تقریبیں اسلامی کیلنڈر کے بارھویں مہینے یعنی ذُوالحجہّ کی آٹھ سے شروع ہوکر بارہ تاریخ کو ختم ہوجاتی ہیں۔ خانہ کعبہ کے عِلاوہ مکّہ مکرّمہ کے جن مُقدّس مقاموں میں یہ تقریبیں منعقد ہوتی ہیں اُن کے نام یہ ہیں:

مِنیٰ، عرفات اور مُزدلفہ۔

حج کے دوران میں تمام مرد ایک ہی قسم کا سفید لباس پہنتے ہیں جسے احرام کہتے ہیں۔ احرام کپڑے کی دو چادروں کا نام ہے۔ ایک چادر جسم کے اوپر والے حصّے پر لپیٹی جاتی ہے اور دوسری تہ بند کی طرح نیچے پہنی جاتی ہے۔ عورتیں احرام نہیں باندھتیں۔ ان کے لیے عام، صاف ستھرا، سادہ اور مُہذّب لباس ہی احرام کا کام دیتا ہے۔

حج پاکیزہ سوچ اور نیک عمل کی تربیت دیتا ہے۔ اِس سے ساری دنیا کے مسلمانوں میں اُخوّت اور تعاوُن کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔

حج کے تیسرے روز یعنی 10 ذُوالحجہّ کو عیدُالاضحیٰ ہوتی ہے۔ اِس روز حاجی مُزدلفہ اور مِنیٰ میں حج کے بعض بڑے اہم فرائض کی ادائیگی میں ہمہ تن مصروف ہوتے ہیں۔ اِس لیے اُنہیں عیدُالاضحیٰ کی اجتماعی نماز سے مُستثنیٰ کردیا گیا ہے۔

عیدُ الاضحیٰ مسلمانوں کا بہُت بڑا تہوار ہے۔ صدیاں گزریں اللہ تعالیٰ نے اپنے مُحترم نبی حضرت اِبراہیم علیہِ السّلام کو اپنے پیارے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہِ السّلام کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کا حکم دیا تھا۔ اپنے لختِ جگر کو قربان کردینا کوئی آسان کام نہیں۔ مگر اللہ کے وہ فرماں بردار نبیؑ اللہ کے حکم کی تعمیل کے لیے بیٹے کو ساتھ لے کر فوراً گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ اپنے حکم کی تعمیل پر یوں آمادہ دیکھ کر اللہ تعالیٰ نے اُنہیں حکم دیا کہ بیٹے کی بجائے کوئی جانور ذبح کردیں۔ چُناں چہ آپ نے اِس حکم کی فوراً تعمیل کی۔

عیدُالاضحیٰ کی نماز کے بعد مسلمان جانور کی قربانی سے تہوار کا آغاز کرتے ہیں۔ قربانی سے وہ گویا اِس عزم کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہر قسم کی قربانی کے لیے ہر وقت تیّار ہیں۔ مُفلِس لوگوں پر قربانی فرض نہیں ہے۔

عید کی نماز اور قربانی کے بعد سب مسلمان خوشیاں مناتے ہیں، خوب کھاتے پیتے ہیں اور دوستوں، عزیزوں سے ملتے جُلتے ہیں۔ چنانچہ عید کے روز ہر جانب قہقہوں اور مسرّتوں کا غلغلہ رہتا ہے۔

دانائی کی باتیں

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

Sharjeel Ahmed

سُنہری چپّل

سنہری چڑیا بولی:

پیارے بچّو، قدیم مِصری بادشاہوں کو فِرعون کہتے تھے، اور باشندوں کو قِبطی۔ فرعونوں کی سلطنت وسیع اور مضبوط تھی۔ قبطی سورج کی پرستش کرتے تھے۔ وہ گائے کی پوجا بھی کرتے تھے۔ ایسے لوگوں کو مُشرِک اور بُت پرست کہتے ہیں۔

بہر حال، ایک تھا فِرعون۔ اُس کی ایک ہی بیٹی تھی۔ وہ بہت ذہین اور خوبصورت تھی۔ بادشاہ اور ملکہ دونوں اُس سے بہُت پیار کرتے تھے۔

ایک روز شہزادی اپنی سہیلیوں کے ساتھ دریائے نیل کے کنارے نہانے گئی۔ اُس نے اپنی سونے کی چپّلوں کو کپڑوں کے ساتھ کنارے پر رکھا اور خود نہانے لگی۔ جب وہ نہا کر باہر نکلنے والی تھی تو اچانک ایک عُقاب اُس کی چپّلوں پر جھپٹا اور ایک چپّل اُچک کر اُڑ گیا۔ شہزادی کو اپنی چپلوں سے بے حد محبّت تھی۔ اُسے چپّل کے جانے کا بہُت صدمہ ہوا۔

بادشاہ کو اِس واقعے کی اِطّلاع ملی تو اس نے اِرد گِرد کے علاقوں میں چپّل کی تلاش میں ہرکارے بھجوائے اور شہزادی، جو غم زدہ تھی، اُسے دلاسا دیا کہ تمہاری چپّل مل جائے گی، لہٰذا فکر نہ کرو۔ لیکن شہزادی کی افسُردگی روز بروز بڑھتی چلی گئی۔

ملکہ نے شہزادی کو خوش کرنے کی خاطر ایک جوڑی چپّل اور بنوا دی، جس میں ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ شہزادی کو اپنی کھوئی ہوئی چپّل کا اِس قدر ملال تھا کہ اُس نے نئی چپلیں پہننے سے اِنکار کردیا۔ عُقاب کے چپّل لے جانے کا واقعہ چوں کہ غیر معمولی تھا، اِس لِیے اِس کا دور دور تک چرچا ہوا۔

بچّو، اِدھر شہزادی چپّل کے غم میں گھلی جارہی تھی، اُدھر خدا کا کرنا کیا ہوا کہ شام کا شہزادہ اپنے باپ کے تخت کے قریب بیٹھا تھا کہ اچانک وہ عقاب نمودار ہوا، اور شہزادی کی چپّل شہزادے کی گود میں ڈال کر غائب ہوگیا۔

یہ عجیب و غریب واقعہ دیکھ کر بادشاہ اور درباری حیران رہ گئے۔ سب نے اِسے نیک شگون کہا اور چپّل دیکھ کر اُنہیں یقین ہوگیا کہ یہ کسی شہزادی کی ہوگی۔ عُقاب کا چپّل کو شہزادے کی گود میں ڈالنے کا مطلب یہ لیا گیا کہ اُس کی شادی چپّل والی شہزادی سے ہوگی۔

شہزادےنے بھی یہی سمجھا۔ اُس نے دل میں فیصلہ کرلیا کہ وہ چپّل والی شہزادی ہی کو اپنی ملکہ بنائے گا۔ چُناں چہ اُس کا کھوج لگانے کے لِیے اُس نے چاروں طرف اپنے ہوشیار کارندے بھجوا دیے۔ شہزادی کو اپنی چپّل کا غم تھا تو شہزادے کو چپّل والی کا غم ستا رہا تھا۔ وقت گزرتا گیا، لیکن دونوں کے لِیے ایک ایک دن ایک ایک سال کے برابر تھا۔ سچ ہے: غم میں ایک دن ایک سال کے اور خوشی میں ایک سال ایک دن کے برابر ہوتا ہے۔

ایک روز شہزادہ دربار میں بیٹھا تھا کہ اُس کے حضور میں ایک سوداگر کو پیش کیا گیا۔ اُس نے شہزادے کو ملک ملک کی قیمتی اور خوبصورت چیزیں دکھائیں۔ شہزادہ چوں کہ غم زدہ تھا، اُس نے اِن چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ پھر اُس نے شہزادی کی چپّل نکالی اور سوداگر سے کہا "مجھے اِس چپّل کا دوسرا پاؤں چاہیے"۔

سوداگر نے عرض کیا "شہزادۂ عالَم، یہ چپّل مِصر کی شہزادی کی ہے، جسے کوئی عُقاب لے اُڑا تھا"۔

یہ سُن کر شہزادہ خوشی سے اُچھل پڑا۔ اُس نے سوداگر سے بہت سی چیزیں خریدیں اور اُسے اپنا مہمان بنالیا۔

رات کو کھانے کے بعد شہزادے نے سوداگر سے کہا "مجھے اپنے ساتھ مصر کے بادشاہ کے دربار میں لے جاؤ۔

میں یہ چپّل خود شہزادی کو پیش کروں گا"۔

شہزادہ باپ سے اِجازت لے کر سوداگر کے ساتھ مِصر روانہ ہوگیا۔ بادشاہ نے اُس کی حفاظت کے لِیے چند بہادُر اور وفادار سوار اُس کے ساتھ کردِیے۔

اُدھر شہزادے کو چپّل والی شہزادی سے ملاقات کا شوق ستا رہا تھا' اِدھر شہزادی کو اُس کے سُراغ رسانوں نے اِطلّاع دی کہ آپ کی چپّل شام کے شہزادے کے پاس ہے۔ وہ آپ کو خود پیش کرنے کے لِیے آرہا ہے اور عن قریب پہنچنے والا ہے۔ شہزادی یہ خوش خبری سُن کر بہُت خوش ہوئی۔ اُس نے سُراغ رسانوں کو اِنعام و اِکرام سے نوازا۔

چند روز کے بعد شہزادہ سوداگر کے بھیس میں اُس سوداگر کے ساتھ مصر پہنچ گیا۔ شہزادی کو اِطلّاع ملی تو اُس نے سوداگر کو اپنے محل میں بُلایا اور بہت سی چیزیں خرید کر بولی "سوداگر' سُنا ہے کہ شام کے شہزادے کے پاس میری ایک گُم شُدہ چپّل ہے۔ کیا آپ کو اِس کا کچھ عِلم ہے؟"

سوداگر اِسی سوال کا اِنتظار کررہا تھا۔ اُس نے شہزادے کی طرف اِشارہ کیا اور عرض کیا کہ یہی شام کا شہزادہ اور ولی عہد ہے۔

شہزادی : شہزادے' کیا آپ کے پاس میری چپّل ہے؟

شہزادہ : جی' شہزادی حضُور۔

شہزادی : دکھایئے۔

شہزادے نے سنہری چپّل نکالی اور شہزادی کو پیش کردی۔ شہزادی چپّل دیکھ کر بے اِنتہا خوش ہوئی۔ بولی "میں اِسے خریدنا چاہوں گی"۔

شہزادہ : میں اِسے آپ کے پاس بیچنے ہی کے لِیے آیا ہوں۔

شہزادی : آپ اِس کا کیا لیں گے؟

شہزادہ : مُنہ مانگے دام۔

شہزادی : منظور ہے۔ دام بتایئے۔

شہزادہ : آپ وعدہ کیجیے کہ اِس کے جو دام مانگوں گا' آپ سُن کر ایک تو خفا نہ ہوں گی' اور دوسرے وہ دام مجھے عنایت کردیں گی۔

شہزادی : اگر ایسا کرنا میرے بس میں ہُوا تو۔

شہزادہ : کیا آپ اپنے بس میں ہیں؟

شہزادی : (سوچ کر) ہاں' میں اپنے بس میں ہوں۔

شہزادہ : تو پھر شہزادی صاحِبہ' اِس کی قیمت خود آپ ہیں۔

شہزادی یہ سُن کر پریشان بھی ہوئی اور خوش بھی۔ پھر بولی "اِس کا جواب کل اَبّا حضور دیں گے"۔

سہیلیوں نے شہزادی کے کہنے پر یہ ساری باتیں ملکہ کو بتادیں اور ملکہ نے بادشاہ کو۔ دوسرے روز بادشاہ نے شہزادے کو بُلایا۔ اُس نے شہزادے سے گفت گُو کی تو اُس کی ذِہانت سے بہت مُتأثّر ہوا۔ اُس کی شکل نے بھی بادشاہ کے دل کو موہ لیا تھا۔

بادشاہ نے درباریوں سے مشورہ کیا تو سب نے شہزادے کو شہزادی کا موزوں ترین بر قرار دیا۔

کئی روز تک شہزادے کی خوب خاطِر مُدارت ہوتی رہی۔ پھر اُسے بڑے تپاک کے ساتھ رُخصت کیا گیا اور کہا گیا کہ وہ برات لے کر آئے۔

شہزادی کے بیاہ کی تیاّریاں زور شور سے شروع ہوگئیں۔ محل میں جشن کا سماں تھا۔ شہزادی' اُس کی سہیلیوں اور قریبی رشتے داروں کے لِیے ہر روز' روزِ عید اور ہر شب' شبِ برأت تھی۔ آخر شہزادہ برات لے کر آیا۔ مصر کو دُلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ پھر بڑی دھوم دھام سے شہزادی کی شادی ہوئی اور بڑی شان سے اُسے رخصت کیا گیا۔ شہزادی کی چپّل گُم ہوئی تو اُسے خوب صورت شہزادہ مل گیا۔ اِس سے مجھے اللہ میاں کا یہ اِرشاد یاد آیا کہ "جس چیز کو انسان اپنے لِیے بُرائی سمجھتا ہے' اُس میں اُس کے لِیے بھلائی ہو سکتی ہے"۔

فوزیہ طاہرہ

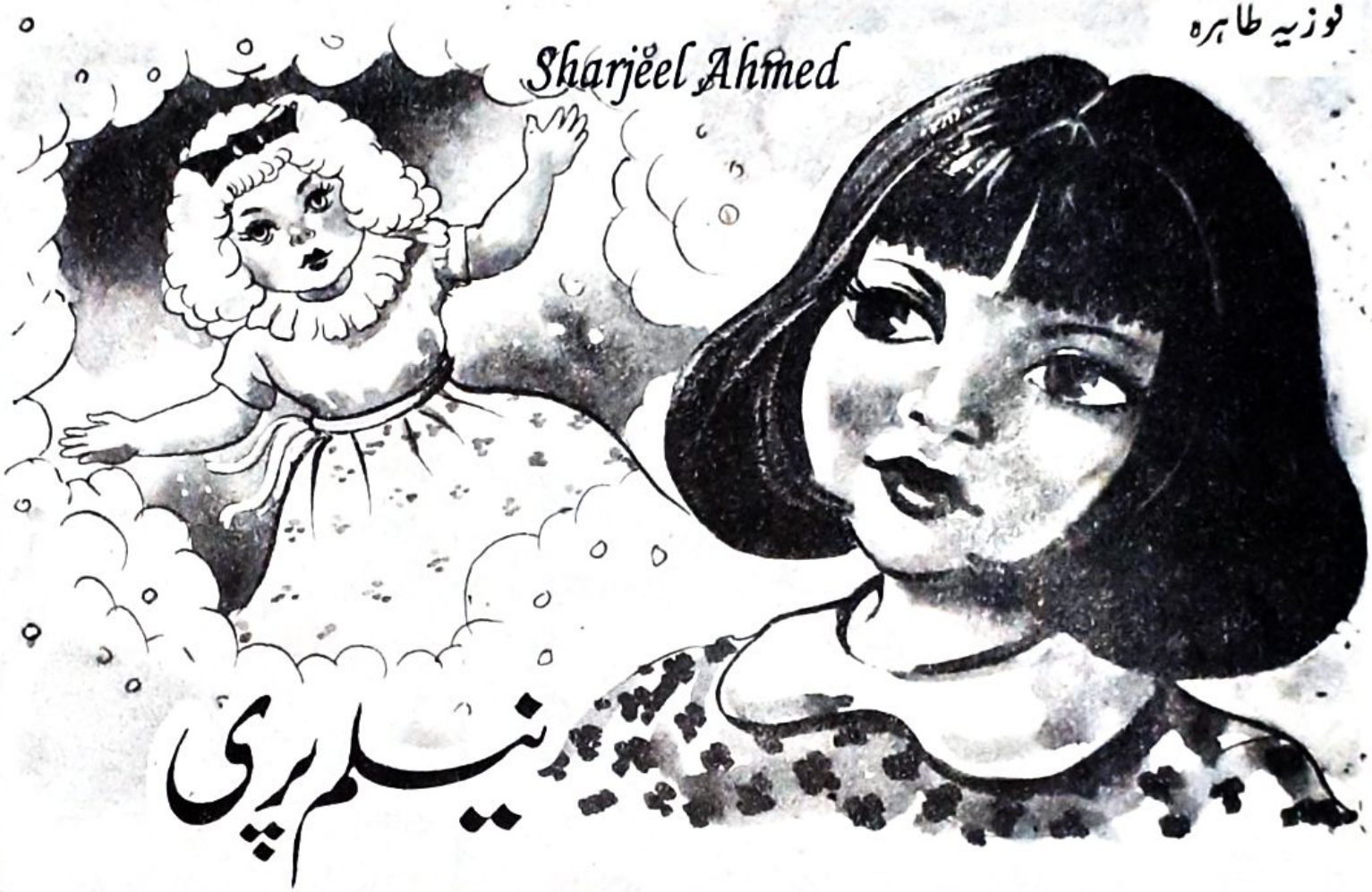

نیلم پری

رافعہ سب کی چہیتی تھی۔ فرحان اگرچہ اُس سے دو سال بڑا تھا لیکن کیا مجال کہ اُس کی کسی بات کو ٹال سکے۔ کبھی کبھار تو اپنی اِس لاڈلی بہن کے ساتھ اُسے گڑیا گڑیا بھی کھیلنا پڑ جاتا۔ رافعہ کو اپنی نیلی آنکھوں اور بھورے بالوں والی گڑیا پسند بھی تو بہت تھی۔ جبھی تو اُسے پیار سے "نیلم پری" کہا کرتی تھی۔

آج کل تو دونوں بہن بھائیوں کی چاندی تھی۔ ایک تو دادا جان کا ہسپتال میں داخل ہونا اور امّی ابّو کا ہر روز ہسپتال جانا۔ اور دوسرے چچا جان کی فیملی کا اُن کے ہاں آنا۔ جیسے ہی چچا جان کو اپنے والد کی بیماری کی خبر ملی، وہ اگلے ہی چند گھنٹوں میں اپنی بیگم اور دونوں بیٹوں، دانیال اور بلال، کے ساتھ سیال کوٹ سے لاہور آگئے۔ رافعہ کے امّی ابّو اور اُس کے چچا شاہد کا تمام دن ہسپتال آنے جانے میں ہی گزر جاتا۔ زیتون بی بی جو گھر کی پُرانی مُلازمہ تھی، گھر کو سنبھالے ہوئے تھی۔

چُوں کہ آج دادا جان کو ہسپتال سے فارغ کیا جانا تھا، اِس لیے رافعہ کے امّی ابّو کے علاوہ چچا شاہد اور چچی روزینہ بھی دوپہر کا کھانا کھاتے ہی ہسپتال چلے گئے تھے۔ گھر میں اِن چاروں بچّوں کے علاوہ صرف زیتون بی بی تھی جس کو خاص تاکید کی گئی تھی کہ بچّوں کا دھیان رکھے۔ لیکن بچّے کہاں قابو میں آنے والے تھے۔ آج ہی تو اُنہیں ڈھنگ سے کھُل کھیلنے کا موقع میسّر آیا تھا۔

فرحان کا خیال تھا کہ گھر کے قریب گراؤنڈ میں جاکر کرکٹ کھیلی جائے۔ اُس کی یہ تجویز سوائے رافعہ کے سب کو پسند تھی۔ رافعہ چاہتی تھی کہ گھر میں بیٹھ کر گڑیا کا بیاہ رچایا جائے، زیتون بی بی سے طرح طرح کے کھانے پکوائیں اور جی بھر کر مزے اُڑائیں۔

"رانی بہن، تم اپنی گڑیا کا بیاہ رچاؤ گی تو تمہاری گڑیا کو اُس کا دولہا اپنے ساتھ لے جائے گا۔ تم اُداس نہیں ہو جاؤ گی؟" دانیال نے کہا۔

"یہ سچ مچ کا بیاہ تھوڑی ہوگا" رافعہ نے جواب دیا۔

"رافی' جو دانی بھیّا کی بات نہیں مانتا ناں' دانی بھیّا اُسے جادو کے زور سے کوئی اور چیز بنادیتے ہیں" بلال نے رافعہ کو ڈراتے ہوئے کہا اور شرارت سے فرحان کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

"کیا....؟.....سچ مچ.....؟" رافعہ نے بوکھلا کر پُوچھا۔

"میں جادو کا منتر پڑھ کر جو چیز چاہوں' غائب کردوں" دانیال نے گردن اکڑاتے ہوئے کہا۔

"میری نیلم پری کو آپ نے غائب کردیا تو اُسے تو گھر کا پتا بھی معلوم نہیں۔ وہ بھلا واپس کیسے آئے گی' دانی بھیّا؟" رافعہ واقعی ڈر گئی تھی۔ اُس نے جلدی سے گراؤنڈ میں جانے کی ہامی بھرلی۔ لیکن ساتھ ہی ایک شرط بھی لگادی کہ اُسے ایک کاغذ پر گھر کا پتا لکھ کر دیا جائے تاکہ وہ اُسے اپنی گڑیا کے گلے میں ڈال سکے۔

چار و ناچار' فرحان کو ہی یہ کام کرنا پڑا۔ اُس نے ایک گتّے پر اپنے گھر کا پتا اور گڑیا کا نام موٹے حروف میں لکھا اور پھر ایک موٹی سی ڈوری میں پرو کر نیلم پری کی گردن میں باندھ دیا۔ رافعہ کو خواہ مخواہ ہی وہم ہوگیا تھا کہ دانی اُس کی گڑیا کو جادو کے زور سے غائب کردے گا۔ اِس لیے اُس نے اپنی نیلم پری کو چھوٹی سی شال میں لپیٹ رکھا تھا اور وہ دیکھنے میں یوں معلوم ہوتی تھی جیسے چھ ماہ کا کوئی بچّہ ہو۔

رافعہ کی یہ نیلم پری اُس کے ماموں نے اُسے سوئیٹزر لینڈ سے بھیجی تھی۔ نرم و نازک سی اِس گڑیا کے مُنہ میں چُوسنی تھی' اور خاص بات یہ تھی کہ چُوسنی اُس کے مُنہ سے نکال دی جاتی تو وہ زور زور سے رونا شروع کردیتی تھی۔ اُس کے اندر ایک کیسٹ فِٹ کی گئی تھی' جس میں بچّے کے رونے کی آواز بھری ہوئی تھی۔ خاصی مہنگی گڑیا تھی' اِس لیے رافعہ اُسے بڑی اِحتیاط سے رکھتی تھی۔

سب بچّوں نے اپنا کھیل کا سامان اُٹھایا اور گراؤنڈ میں کرکٹ کھیلنے کے لیے چل دیے۔ گراؤنڈ گھر سے صرف چند قدم کے فاصلے پر ہی تھا۔ اور یُوں بھی اُس کے بائیں جانب صنعتی نُمائش لگی ہوئی تھی اور تقریباً آدھے گراؤنڈ میں قناتیں تنی ہوئی تھیں۔ فرحان نے قناتوں سے 20 گز پرے اپنی وکٹیں زمین میں گاڑ دیں۔ دانیال بلاّ پکڑ کر خاص پوزیشن میں کھڑا ہوگیا .... اور دانیال باؤلنگ کرانے لگا۔ رافعہ اپنی گڑیا کو شال میں لپیٹے مالی بابا کے پاس جاکر کھڑی ہوگئی۔ وہ گراؤنڈ کے دائیں جانب کیاریوں میں نلائی (گوڈی) کررہا تھا۔

"ہاؤا" رافعہ نے مالی بابا کو ڈرانے کے لیے خوف ناک سی آواز نکالی۔

"ارے رافی بٹیا' تُم!" مالی بابا نے کہا۔

"مالی بابا' میری نیلم پری تمہیں سلام کہہ رہی ہے" رافعہ نے گڑیا کا ہاتھ اُس کے ماتھے پر رکھتے ہوئے کہا۔

"وعلیکمُ السّلام۔ جیتی رہو تم بھی اور تمہاری نیلم پری بھی ... اچّھا یہ بتاؤ' خواجہ صاحب کا کیا حال ہے؟ ہسپتال سے آئے کہ نہیں؟" مالی بابا نے پوچھا۔

"آج شام تک گھر آجائیں گے۔ امّی ابّو اُنہیں لینے گئے ہیں۔"

"اللہ تعالیٰ خواجہ صاحب کو صحّت دے۔ بڑے نیک اِنسان ہیں۔ سارا عِلاقہ اُن کی بڑی عزّت کرتا ہے" مالی بابا نے کہا اور پھر کھُرپی سے مٹّی کو اُتھل پُتھل کرنے لگا۔

"دانی بھیّا! میں بھی ایک باری لُونگی" رافعہ ضِد کرنے لگی۔ فرحان جانتا تھا کہ رافعہ کو بلاّ پکڑنا بھی نہیں آتا' کھیلے گی کیا۔ لیکن اب ضد کر بیٹھی ہے' اِس لیے ٹلنے کی نہیں۔ وہ مان گیا۔

رافعہ کا چہرہ کِھل اُٹھا۔ لیکن پھر وہ سوچنے لگی کہ اگر گڑیا کو زمین پر لِٹائے گی تو اُس کے کپڑے خراب ہوجائیں گے۔ اچانک ایک خیال اُس کے ذِہن میں آیا۔ اُس نے مالی بابا سے پُوچھا کہ کیا وہ اپنی نیلم پری اُس کی کُٹیا میں رکھ آئے۔ مالی بابا کو بھلا کیا اِعتراض ہوسکتا تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی کُٹیا کے اندر گئی اور نیلم پری کو کھاٹ پر لِٹادیا۔ مالی کی یہ کُٹیا گھاس پُھونس کی بنی ہوئی تھی اور صنعتی نُمائش کی

قناتوں کے قریب ہی تھی۔

رافعہ اپنی نیلم پری کی طرف سے مُطمئن ہو کر اپنے ساتھیوں سے آملی اور اپنی باری کا اِنتظار کرنے لگی۔ دانیال اور بِلال خوب جم کے کھیل رہے تھے۔ فرحان آؤٹ ہو چکا تھا۔ اِس سے پہلے کہ رافعہ کا پارہ آسمان کو چھُونے لگتا' دانیال نے اُس کے تیوَر بھانپ لیے اور اُس کے ہاتھ میں بلّا تھما دیا۔ خود باؤلنگ کرانے لگا۔ رافعہ کی تو خوشی کی اِنتہا نہ رہی۔ اگرچہ اُلٹی سیدھی بیٹنگ کر رہی تھی' لیکن پھر بھی بڑی خوش تھی۔

اُسی وقت پکڑو' پکڑو کا شور سُنائی دیا۔ کچھ لوگ قناتوں سے باہر بھی نکلے' لیکن کچھ پتا نہ چل سکا کہ ہُوا کیا ہے۔ بچّے کھیلتے کھیلتے چونکے لیکن پھر کھیل میں مشغول ہو گئے۔ مالی بابا نلائی میں مصروف تھا۔ کبھی کبھار بچّوں کو کرکٹ کھیلتے ہوئے بھی دیکھ لیتا تھا کہ اچانک اُس کی نظر اپنی کُٹیا کی جانِب پڑی۔ اُسے یُوں لگا جیسے کوئی شخص کالی چادر کی بُکّل مارے' اُس کی کُٹیا میں سے نِکل کر بھاگا ہے۔

"کون ہے؟ رانی بیٹا' دیکھنا ذرا" مالی بابا حیران حیران سا کُٹیا کی جانِب دیکھ رہا تھا۔

"اوہو! مالی بابا! ایک تو تُم وہمی بہت ہو۔ تُمہاری کُٹیا میں دھرا ہی کیا ہے جو کوئی چُرا لے جائے گا" فرحان نے بات مذاق میں ٹالتے ہوئے کہا اور پھر باؤلنگ کرانے لگا۔

رافعہ اپنی باری لے کر فارِغ ہو چکی تھی۔ وہ ایک جانِب بیٹھ کر کھیل دیکھ رہی تھی کہ رونے کی آواز پر اُس کے کان کھڑے ہو گئے۔

"ہائے! میری نیلم پری!" اُسے فوراً اپنی گُڑیا کا خیال آیا۔ کہیں اُس کے مُنہ سے چُوسنی نہ گر گئی ہو۔ جبھی تو کُٹیا کے اندر سے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ وہ دوڑتی ہوئی مالی بابا کی کُٹیا میں گئی' لیکن فوراً ہی چیخیں مارتی ہُوئی واپس پلٹی۔ اِسی دوران میں دانیال' بِلال اور فرحان کے عِلاوہ مالی بابا بھی آپہنچے تھے۔

"مالی بابا! میری نیلم پری پر دانی بھیّا نے جادو کر دیا ہے" رافعہ نے روتے ہوئے کہا۔

"ارے! ....واقعی.....!" سب کے سب ایک دوسرے کا مُنہ تکنے لگے "یہ زندہ کیسے ہو گئی؟"

"میں سچ کہتا ہُوں۔ میں نے کوئی جادو نہیں کیا" دانیال بولا۔

سب اپنی اپنی ہانکے جا رہے تھے' رافعہ تو رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔ اُسے تو ہر صورت اپنی نیلم پری چاہیے

تھی۔ لیکن اِس وقت اہم مسئلہ اُس بچّی کا تھا جو گڑیا کی جگہ لیٹی ہوئی تھی' اور شاید بھوک کے مارے بُری طرح رو رہی تھی۔ مالی بابا نے بسم اللہ پڑھ کر بچّی کو گود میں اُٹھالیا۔ وہ حیران تھا کہ اِس بچّی کو یہاں کون ڈال گیا' اور رافعی کی گڑیا کیوں لے گیا؟

اُسے اچانک اُس کالی چادر والے شخص کا خیال آیا جسے وہ صحیح طور پر دیکھ نہ سکا تھا۔ عجیب مُعمّا تھا جو کسی کی سمجھ میں نہ آرہا تھا۔ بچّی تھی کہ رو رو کر ہلکان ہوئی جارہی تھی۔ دو چار بار چمچے سے پانی پلانے کی کوشش بھی کی گئی لیکن وہ کسی طرح چُپ نہیں ہوئی۔ دس پندرہ منٹ اِسی طرح گزر گئے۔ مالی بابا کو یقین تھا کہ جس کی بچّی ہوگی' وہ ڈھونڈتا ہُوا اِس طرف ضرور آئے گا۔ وہ بچّی کو لے کر کُٹیا کے باہر کھڑا ہوگیا۔

"مالی بابا' رانی کی گڑیا کا فیڈر گھر میں پڑا ہے۔ ابھی لے کر آتا ہُوں۔ یہ بچّی بھوک کی وجہ سے رو رہی ہے" یہ کہہ کر فرحان اپنے گھر کی جانب دوڑ پڑا۔

جب وہ ہانپتا کانپتا گھر کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ گیٹ پر اُس کے والد' چچا شاہد اور دو تین پولیس والے کھڑے ہیں۔ اُن کے ساتھ ایک اور شخص سر جُھکائے کھڑا تھا' جس نے کالی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ خدا خیر کرے! اُس نے دِل ہی دِل میں دُعا مانگی۔ اُسی وقت اُس کی نظر ابّو کے ہاتھ پر پڑی۔ اُس نے چونک کر کہا "ابّو' آپ کے ہاتھ میں رانی کی گڑیا؟"

"ہاں' بیٹا" ابّو نے کہا "تھانے دار صاحب یہ گڑیا لے کر آئے ہیں"۔

اِس سے پہلے کہ فرحان کے والد اور کچھ کہتے' تھانے دار درمیان میں بول پڑا "یہ تو اچھا ہُوا کہ گڑیا کے گلے میں آپ نے ایڈریس لکھ کر باندھ دیا تھا۔ بھلا خواجہ صاحب کے گھر کو کون نہیں جانتا۔ مجھے شک گزرا کہ یہ بدبخت ضرور آپ کے گھر سے اِس گڑیا کے علاوہ قیمتی سامان بھی چُرا کر لے گیا ہوگا۔ اِسی خیال سے ہم آپ سے معلوم کرنے آگئے" تھانے دار نے اُٹھائی گیرے کی طرف اِشارہ کرکے کہا اور دو ایک جھانپڑ بھی اُس کے جڑ دیے۔

"اچھا جناب' اب ہمیں اِجازت دیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اِس بدبخت نے گڑیا ہی چُرائی تھی۔ کچھ زیادہ نقصان نہیں ہُوا آپ کا" تھانے دار بولا۔

"اِس کا مطلب ہے کہ وہ بچّی بھی" فرحان کا جُملہ مکمّل نہ ہوپایا تھا کہ تھانے دار کے قدم وہیں جم گئے۔

"بچّی؟ کون سی بچّی؟" اُس نے پوچھا۔

"مالی بابا کی کُٹیا میں رانی نے اپنی گڑیا رکھی تھی۔ تھوڑی دیر بعد گڑیا وہاں سے غائب تھی اور اُس کی جگہ ایک ننھّی منّی بچّی لیٹی رو رہی تھی" فرحان نے کہا۔ اُس کی یہ بات سُن کر تھانے دار کا ماتھا ٹھنکا۔ اُس نے دانت پیستے ہوئے اُٹھائی گیرے کی جانب دیکھ کر کہا "سچ سچ بتا' کیا مُعاملہ ہے؟ کس کی بچّی اُٹھا کر لایا تھا؟ بول!"

اُٹھائی گیرا بدحواس ہوکر ہاتھ پیر جوڑنے لگا اور قسمیں کھا کھا کر اپنی لاعلمی کا اِظہار کرتا رہا۔ تھانے دار بھانپ گیا کہ یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے۔ اِس لیے اصل مُعاملے کی تہ تک پہنچنے کے لیے اُس نے گراؤنڈ میں جانا ضروری سمجھا۔ گراؤنڈ میں ایک ہجُوم اکٹھا تھا۔ کُٹیا کے قریب مالی بابا دانیال' بلال اور رافعہ کے علاوہ ایک خاتون بھی موجود تھی جو اُس بچّی کو گود میں لیے دیوانوں کی طرح پیار کررہی تھی۔

"اللہ نے بڑا کرم کیا ہے' جی۔ بچّی کے وارث مِل گئے ہیں' جی" مالی بابا نے فرحان کے ساتھ تھانے دار کو آتے دیکھ کر کہا۔

"اور رافعی کی نیلم پری بھی مِل گئی ہے" فرحان نے رافعہ کے ہاتھ میں گڑیا تھماتے ہوئے کہا۔ وہ مارے خوشی کے ناچنے لگی۔ دانیال اور بلال بھی بہت خوش تھے۔

مالی بابا اُٹھائی گیرے کو دیکھتے ہی چونک پڑا۔ بولا "تھانے دار صاحب' یہی وہ شخص ہے جس کو میں نے اپنی کُٹیا میں سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ بالکل یہی کالی چادر اُس نے اوڑھ رکھی تھی۔"

اب بچّی ماں کی گود میں کھیل رہی تھی۔ لیکن اُس عورت کو تو جیسے یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ وہ سب سے بے خبر، بچّی کو سینے سے لگائے، اللہ کا بار بار شکر ادا کررہی تھی۔

"بی بی، آپ بھی اپنے بچّوں کا دِھیان رکھا کریں" تھانے دار نے اُس عورت پر تھانے داری جھاڑی۔

"تھانے دار صاحِب، میں اور میری مُلازِمہ نمائش دیکھنے آئے تھے۔ یہ بچّی گاڑی میں لیٹی ہوئی تھی۔ خدا غارت کرے اِس مردُود کو، جانے کس طرح نظر بچا کر میری پھول سی بچّی کو لے اُڑا" یہ کہہ کر اُس نے بچّی کو چادر میں چھُپا لیا۔ اُٹھائی گیرا سر جُھکائے کھڑا تھا۔

"مجھے معاف کردیں، جی۔ میں اُٹھائی گیرا نہیں ہُوں، جی۔ پہلی بار ایسی غلطی ہوئی ہے، جی۔ مزدوری نہیں ملی تو بھیک مانگنی شروع کردی۔ بی بی جی سے بھیک مانگی تو اِنہوں نے دُھتکار دیا۔ بس جی، غصّے میں آکر اِن کی بچّی اُچک لی۔ لیکن کچھ لوگوں نے ایسا کرتے دیکھ لیا۔ وہ میرے پیچھے دوڑے تو میں اِس کٹیا میں چُھپ گیا۔ یہاں کھاٹ پر یہ گڑیا پڑی تھی۔ میں بہت گھبرایا ہُوا تھا۔ پہلے کبھی ایسا کام نہیں کیا تھا، اِس لیے پولیس سے بچنے کے لیے بچّی کو کھاٹ پر لٹایا اور گڑیا اُٹھالی، تاکہ پکڑا بھی گیا تو گڑیا کی چوری کے اِلزام میں سزا سے بچ جاؤں گا۔ لیکن جب کُٹیا سے نکل کر بھاگا تو اُن سپاہیوں نے جو قناتوں کے باہر ڈیوٹی پر تھے، مجھے پکڑ لیا" اُٹھائی گیرے نے سچ سچ اپنی ساری کہانی سُنا ڈالی، اور پھر اُس عورت کے پیروں پر گر کر گڑگڑانے لگا۔ عورت رحم دِل تھی۔ اُس نے تھانے دار کو اُس کی سزا میں رِعایت کرنے کی سِفارش کی اور بچّی کو لے کر چلی گئی۔

"قانون کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں۔ سمجھے؟ باقی معاملہ تھانے میں طے ہوگا۔ چلو!" یہ کہہ کر تھانے دار نے فرحان کے والِد سے اِجازت لی اور اُٹھائی گیرے کو لے کر چل دیا۔

"دانیال، بھیّا، آپ بھی مجھے مُعاف کردیں۔ میں نے آپ پر غلط اِلزام لگایا تھا" رافِعہ نے کہا۔

"ہم تمہیں مُعافی ضرور دیں گے، لیکن ہمیں آئس کریم کِھلانی ہوگی" دانیال نے اُس کا گال سہلاتے ہوئے کہا۔

"وہ کس خوشی میں؟" بلال نے پوچھا۔

"شاید اِس لیے کہ رانی نے اپنی نیلم پری کے گلے میں جو ایڈریس لکھ کر باندھا تھا، اُس کی وجہ سے ایک ماں کو اپنی بچّی مل گئی" فرحان کے چچا شاہد نے کہا۔

"میرے ابّو جبھی تو کہتے ہیں کہ میں گھر میں سب سے زیادہ عقل مند ہُوں" رافِعہ نے موٹی موٹی آنکھیں گھُما گھُما کر کہا۔

"اور ہم جادو کے زور سے تمہاری یہ عقل مندی چھین بھی سکتے ہیں" دانیال نے گردن اکڑا کر اور آنکھیں بند کرکے کہا۔

"ارے بھئی، مت ڈراؤ ہماری رانی بِٹیا کو۔ یہ چھوٹا سا گُل دستہ رانی بی بی کا اِنعام ہے" مالی بابا نے رافِعہ کے چہرے پر پریشانی دیکھتے ہوئے کہا۔

اِنعام کا لفظ سُنتے ہی رافعہ کا چہرہ کِھل اُٹھا۔ "جیتے رہو بابا، خوب پھلو، پھولو" وہ اپنے دادا جان کے سے انداز میں مالی بابا کو دُعا دیتے ہوئے بولی۔ یہ سُن کر سب نے زور دار قہقہہ لگایا۔

کیا مچھلی کے کان ہوتے ہیں؟

جی ہاں، مچھلیوں کے کان ہوتے ہیں اور وہ سُن سکتی ہیں۔ لیکن اُن کے کان باہر سے نظر نہیں آتے۔ وہ سر کے دونوں طرف، کھال کے اندر ہوتے ہیں۔

مچھلیاں اپنے کانوں سے اِس طرح تو نہیں سُن سکتیں، جس طرح اِنسان سُنتا ہے۔ لیکن وہ پانی کے اندر پیدا ہونے والی آوازیں اور پانی کے باہر اُونچی آوازیں سُن سکتی ہیں۔ تجربہ کار شکاری جانتے ہیں کہ مچھلیاں اُن کی آواز کے مقابلے میں اُن کے قدموں کی آہٹ جلد سُن لیتی ہیں۔ اِس لیے وہ دریا کنارے آہستہ آہستہ چلتے ہیں۔ (س۔ل)

Sharjeel Ahmed

آپ جانتے ہیں؟

- قُطبِ شمالی قطبِ جنوبی سے 2799 میٹر نیچا ہے۔
- جاپان کا کُل رقبہ 147,000 مُربّع کلو میٹر ہے۔
- اُونٹ کی ریڑھ کی ہڈّی بالکُل سیدھی ہوتی ہے۔
- اِنڈونیشیا کے ایک جزیرے 'جاوا' میں ایک جھیل ہے' جس میں ہر وقت بُلبُلے اُٹھتے رہتے ہیں۔
- ایک مکڑی' ایک وقت میں' 600 کے قریب انڈے دیتی ہے۔
- ایک عام آدمی کا وزن 5,000 چُوہوں کے برابر ہوتا ہے۔
- دُنیا میں سب سے زیادہ کتابیں آئرس لینڈ میں پڑھی جاتی ہیں (آئرس لینڈ قُطبِ شمالی کے قریب' شمالی اوقیانوس (اٹلانٹک اوشن) کا ایک جزیرہ ہے۔ یہ چھوٹا سا ملک یورپ ہی کا ایک حصّہ سمجھا جاتا ہے)۔
- لندن کے مشہور گھڑیال "بِگ بین" کا نام' اٹھارہویں صدی کے ایک انگریز سیاست دان کے نام پر رکھا گیا تھا۔ اِس شخص کا وزن 158 کلوگرام (تقریباً 4 من) تھا۔
- صرف امریکا کے بندر دُم کے ذریعے درختوں پر لٹک سکتے ہیں۔ ایشیا اور افریقہ کے بندر ایسا نہیں کرسکتے۔
- نر مچھر گھاس پات کھاتے ہیں۔ اُن کی مادائیں خون پیتی ہیں۔
- ایک آدمی کے سر پر ایک لاکھ کے قریب بال ہوتے ہیں۔
- برطانیہ کے بادشاہ جارج پنجم کے پاس ڈاک ٹکٹوں کے 325 البم تھے۔
- سانڈ رنگ اندھے (کلربلائنڈ) ہوتے ہیں۔
- دنیا میں سب سے زیادہ خوش بو (پرفیوم) روس میں اِستعمال کی جاتی ہے۔
- لان ٹینس کا پہلا میچ 1879ء میں کھیلا گیا۔
- 1972ء میں ایک بلّی 49 میٹر کی بلندی سے نیچے گری اور اُس کے خراش تک نہ آئی۔
- پانی کے ایک قطرے میں دس ارب ایٹم ہوتے ہیں۔
- تتلی اپنی پچھلی ٹانگوں سے کسی چیز کا مزہ معلوم کرتی ہے۔
- انگریز اپنے پالتُو جانوروں کی غِذا پر اپنے بچّوں کی غِذا سے زیادہ پیسہ خرچ کرتے ہیں۔
- دنیا میں تقریباً 20 کروڑ لوگ کھبّے ہیں۔
- 1971ء میں ایک امریکی خلاباز' ایلن شیپرڈ' نے چاند پر گاف کھیلا تھا۔
- انگریزی زبان کا سب سے زیادہ اِستعمال ہونے والا حرف E ہے۔
- مکھی میں مُختلِف بیماریوں کے 30 کے قریب جراثیم ہوتے ہیں۔
- آج سے چار سو سال پہلے جاپانیوں کا اپنے مُلک سے باہر جانا خلافِ قانون تھا۔
- امربیل (آکاش بیل) جس درخت پر اُگتی ہے' اُسی کو کھا کر پھلتی پھُولتی ہے۔ آخرکار وہ درخت مرجاتا ہے۔
- لالی پاپ کا لفظ سب سے پہلے 1792ء میں اِستعمال ہُوا۔
- کیلی فورنیا (امریکا) کے ریڈوُڈ درخت 350 فٹ سے بھی زیادہ اُونچے ہوتے ہیں۔
- اگر کہکشاں کے تمام ستاروں کے نام رکھ دیے جائیں' اور ایک نام بولنے میں ایک سیکنڈ لگے تو تمام نام بولنے میں 4,000 سال لگیں گے۔ (اِس سے اندازہ کریں کہ کہکشاں میں کتنے ستارے ہیں!)۔

کہانی سمندری جہاز کی

سلیم احمد صدیقی

Sharjeel Ahmed

سائیکل سے سنگتروں تک، کوئلے سے کاروں تک ---- عمارتی لکڑی سے تیل تک، دُنیا جہان کی چیزیں سمندری جہازوں کے ذریعے دُنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک لے جائی جا رہی ہیں۔ سامانِ تجارت ایک ملک سے دوسرے ملک بھیجنے کے لیے سب سے اہم ذریعہ سمندری جہاز ہی ہیں۔

ذرا سوچیے، سب سے پہلی کشتی جو اِنسان نے بنائی، وہ کیسی ہوگی؟ کسی آدمی نے درخت کا تنا پانی میں ڈال کر اُس پر سواری کی ہوگی۔ اِس تنے پر سامان تو بس تھوڑا سا ہی رکھا جاتا ہوگا اور چپّو کی جگہ درخت کی شاخ اِستعمال کی جاتی ہوگی۔ اِنسان سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لیے کسی بہتر ذریعے کی تلاش میں ہوگا، اور جب اُس نے بجرا یا بیڑا بنالیا ہوگا تو سُکھ کا سانس لیا ہوگا، کیوں کہ وہ بجرے یا بیڑے پر خاصا سامان لے جاسکتا تھا۔

بجرا بنانے کے لیے لکڑی کے بہت سارے لٹھے (شہتیر) ایک ترتیب سے باندھے جاتے تھے۔ بانس، کدو کے سُوکھے خول، سرکنڈوں کی گڈّیاں اور جانوروں کی کھالیں (ہوا بھر کر) اِس مقصد کے لیے اِستعمال کی جاتی تھیں۔ اِن بیڑوں یا بجروں کی اُوپر کی سطح ہموار ہوتی تھی۔ اِس پر خاصا سامان رکھا جاسکتا تھا اور لوگ بھی بیٹھ سکتے تھے۔

یہ بجرے زیادہ تر سامان ڈھونے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے اور دریا کے بہاؤ کے رُخ پر چلتے تھے۔ چپّو کے ذریعے اِن کی رفتار اور سَمت پر قابو رکھا جاتا تھا۔ کچھ عرصے بعد اِن میں بادبان بھی لگائے جانے لگے۔ مصر کے دریائے نیل میں آج سے سات ہزار سال پہلے بادبانوں والے بجرے چلتے تھے۔ پہلے بادبان جانوروں کی کھالوں سے یا چٹائی کو بانس کے مستُول کے ساتھ باندھ کر بنایا جاتا تھا۔ لیکن اِن بادبانوں میں ایک نقص تھا۔ یہ کشتی کو صرف ہوا کے رُخ پر ہی چلا سکتے تھے۔ لہٰذا مُخالِف سَمت میں چلانے کے لیے چپّو استعمال کیے جاتے تھے۔ بڑے بڑے سمندری جہاز بھی چپّوؤں ہی سے چلائے جاتے تھے۔

بجرے دریا یا سمندر میں ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کے لیے تو ٹھیک تھے۔ لیکن خراب موسم میں پانی کی لہریں اُن کے اُوپر آجاتی تھیں اور اِس طرح مُسافر اور سامان سب بھیگ جاتے تھے۔ اِس مُشکِل کو دُور کرنے کے لیے درختوں کے تنوں کو کھوکھلا کرکے اُنھیں کشتی کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ اِس کے ساتھ ہی بانس کی ہلکی پُھلکی کھپچّیوں سے ڈھانچا بنا کر اور اُس پر جانوروں کی کھال مڑھ کر کشتیاں بنائی جانے لگیں۔

رفتہ رفتہ اِن دونوں طریقوں کو مِلا کر لکڑی کی کشتیاں بنائی گئیں۔ یعنی لکڑی کے تختوں کو اِس طرح جوڑا جاتا کہ کھوکھلا ڈھانچا سا بن جاتا اور یوں جدید کشتیوں کی پہلی شکل وُجود میں آئی۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد اِنسانوں نے

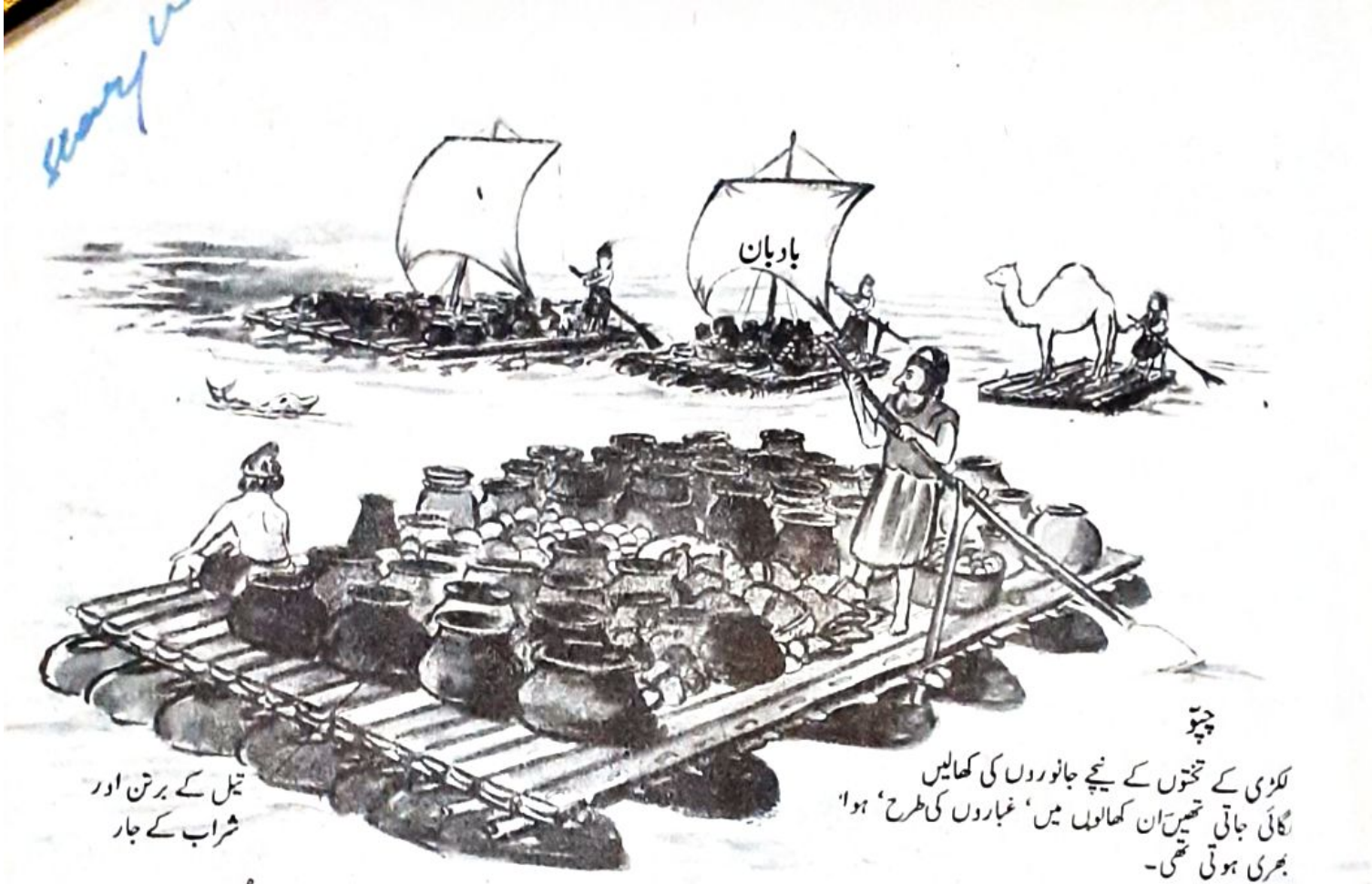

یہ دریافت کیا کہ شہتیروں یا لٹھوں کو کھوکھلا کرنا ضروری نہیں۔ چناں چہ ایک بہت مضبوط تنا یا شہتیر نیچے رکھ کر اُس کے دونوں جانب اِس ترتیب سے لکڑی کے تختے جوڑے گئے کہ وہ ایک بہت بڑی کشتی بن گئی۔ آہستہ آہستہ اِس طریقے سے بڑے بڑے جہاز بنائے جانے لگے، جن میں بہت سے اِنسان سفر کرسکتے تھے اور بہت سارا سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جاسکتا تھا۔ البتہ اِن کو بھی چپّوؤں اور بادبانوں ہی سے چلایا جاتا تھا۔ کیوں کہ سائنس نے ابھی اِتنی ترقّی نہیں کی تھی۔

کچھ عرصے بعد بادبانوں کی بناوٹ میں تبدیلی کی گئی اور اِس طرح کے بادبان بنائے جانے لگے جن سے جہاز کو کسی بھی سَمت میں لے جایا جاسکتا تھا۔ اِن نئے بادبانوں کو چوڑائی کے رُخ کے علاوہ لمبائی کے رُخ پر بھی موڑا جاسکتا تھا۔ اِس مقصد کے لیے مستُول اور رسّوں سے کام لیا جاتا تھا۔ دراصل بادبان سے ٹکرا کر گزرنے والی ہوا بادبان کے مُختلف پہلوؤں پر مختلف دباؤ پیدا کرتی ہے اور دباؤ کے اِسی فرق کی بنا پر پہلُو کی جانب بہاؤ میں مدد مل سکتی ہے۔

جہاز کے جانے کی سَمت دراصل پہلُو کی جانب بہاؤ کی حاصِل شُدہ قُوّت اور پانی کی اُس قُوّت سے مِل کر پیدا ہوتی ہے جو یہ جہاز کے پیندے پر ڈالتا ہے۔ یہ دونوں قُوّتیں ہوا کی قُوّت سے مِل کر جہاز کو مخصوص سَمت میں دھکیلتی ہیں۔ اِس اُصول پر سمندری جہازوں کو ہوا کے مُخالِف رُخ پر لے جانے کے عِلاوہ باقی ہر سَمت میں لے جایا جاسکتا ہے۔ البتّہ ہوا کے رُخ کی مخالِف سَمت میں لے جانے کے لِیے جہاز کو دائیں بائیں گھما کر لے جانا پڑتا ہے۔

بادبانوں والے جہازوں کو چلانا چپّوؤں والے جہاز کو چلانے سے مُشکِل ہوتا تھا۔ چپّوؤں والے جہاز میں یہ سہُولت ہوتی تھی کہ سَمت بدلنے کے لِیے ایک سَمت کے چپّوؤں کو تیز اور دوسری سمت کے چپّوؤں کو آہستہ چلایا جاتا تھا۔ البتّہ اِس قسم کے جہاز کو سمت بدلنے کے لِیے ایک بہت بڑے پتوار کی ضرورت ہوتی تھی۔ اُس کو جہاز کی پُشت پر لٹکایا جاتا تھا اور ایک لمبے بانس سے اُسے ہلایا جاتا تھا۔ بعد میں پتوار کو زنجیروں کے ذریعے ایک پہیّے نُما آلے سے باندھا جانے لگا۔ اِس سے جہاز کی سَمت بدلنا ایسا ہی

آسان ہوگیا' جیسا چلتی ہوئی کار یا بس کا رُخ موڑنا۔

لکڑی کے بنے ہوئے بڑے بڑے بادبانی سمندری جہاز اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط تک کسی بڑی تبدیلی کے بغیر' سمندروں کے سینوں پر رواں دواں رہے۔ اٹھارویں صدی کے وسط کے بعد سمندری جہاز لوہے کے بنائے جانے لگے اور لگ بھگ اِسی زمانے میں بھاپ سے چلنے والے انجن اِستعمال کیے جانے لگے اور یوں بادبانی جہازوں کی جگہ رفتہ رفتہ دُخانی یعنی بھاپ سے چلنے والے جہازوں نے لے لی۔

دُخانی انجن شروع میں بہت بڑے اور بھونڈے ہوتے تھے اور اُن کی کارکردگی بھی اِتنی زیادہ قابلِ اِعتبار نہ ہوتی تھی۔ لہٰذا ملّاح اِنہیں اِستعمال کرنے سے ہچکچاتے تھے۔ چُناں چہ کافی طویل عرصے تک جہازوں میں بادبان اور دُخانی انجن دونوں چیزیں لگائی جاتی رہیں۔ بہر حال' سائنس کی جدید ترقّی کے ساتھ ساتھ بھاپ کے انجن بھی بہتر سے بہتر بنتے گئے اور ۱۹۰۰ء کے بعد سے جہازوں میں بادبانوں کا اِستعمال بالکل ختم کردیا گیا۔

ایک جدید مال بردار سمندری جہاز کا ڈھانچا فولاد کے بڑے بڑے تختوں کو ویلڈنگ کے ذریعے جوڑ کر تیار کیا جاتا ہے۔ فولاد کے بڑے بڑے گرڈر لمبائی اور چوڑائی میں لگا کر اِس ڈھانچے کو خوب مضبوط بنادیا جاتا ہے۔ جب ایک تجارتی جہاز کو سامان سے بھر دیا جاتا ہے تو اُس کے ڈھانچے کا تین چوتھائی حصّہ پانی کی سطح کے نیچے چلا جاتا ہے۔ آج کل اِتنے بڑے جہاز بنائے جاتے ہیں کہ اُنہیں چلنے کے لیے کم از کم 65 فٹ گہرے پانی (ساڑھے چھ منزلہ مکان جتنی گہرائی) کی ضرورت ہوتی ہے۔ اِس لیے بڑے بڑے جہاز اُن بندرگاہوں سے دُور سمندر میں ٹھہرائے جاتے ہیں جن کے قریب سمندری پانی کی گہرائی کم ہوتی ہے۔

آج کل دُنیا بھر کے سمندروں کے سینے پر مُختلف قسم کے مال بردار جہاز رواں دواں رہتے ہیں۔ اِن میں سب سے بڑے دیو قامت جہازوں کو انگریزی میں وی' ایل' سی' سی (V L C C) کہا جاتا ہے۔ اِس کا مطلب ہے "ویری لارج کارگو کیریئر" یعنی بہت بڑے مال بردار جہاز۔ اِن میں بے تحاشا سامان لادا جاسکتا ہے اور خام لوہے سے لے کر تیل اور کیمیائی اشیا تک ہر شے لائی لے جائی جاسکتی ہے۔ کنٹینر جہازوں (Container Ships) میں بڑے بڑے ڈبّوں میں بند سامان لایا لے جایا جاتا ہے اور اِن ڈبّوں کو کرین کے ذریعے جُوں کا توُں جہاز پر لادا اور وہاں سے اُتارا جاتا ہے۔

ہر جہاز پر اُس کے سامان کے لحاظ سے سامان اُتارنے چڑھانے کے آلات لگے ہوتے ہیں۔ ایک عام مال بردار جہاز پر کرینیں ہوتی ہیں۔ اِس کے برعکس کنٹینر والے جہازوں سے کنٹینر یعنی ڈبّے اُتارنے کے لیے بندرگاہ کی گودی میں لگی ہوئی دیو قامت کرینوں سے کام لیا جاتا ہے۔ تیل بردار جہازوں کو ٹینکر کہا جاتا ہے۔ اِن میں بڑے بڑے پمپ ہوتے ہیں جو تیل کو اُتارتے اور چڑھاتے ہیں۔ وی ایل سی سی جہازوں پر تو بائیسکلیں تک ہوتی ہیں جن پر سوار ہوکر جہاز کا عملہ عرشے کے اِس کنارے سے اُس کنارے تک جاتا ہے اور جہاز یا سامان وغیرہ کی پڑتال کرتا ہے۔

جب تک دُنیا میں باربی ڈول نامی گڑیا اور کاریں یا گندم اور کپاس ایک ملک سے دوسرے ملک تک لے جانے کی ضرورت موجود رہے گی' تب تک ہمارے مال بردار سمندری جہاز سمندروں کے سینے پر رواں دواں رہیں گے!

آج کل مال بردار سمندری جہازوں میں اِسٹیم یا دُخانی انجن نہیں ہوتے بلکہ ڈیزل یا گیس کے انجن لگے ہوتے ہیں۔ دُخانی انجن کو چلانا زیادہ مہنگا پڑتا تھا اور اُس کی کارکردگی بھی اِتنی اعلیٰ نہ تھی جتنی جدید ڈیزل یا گیس انجن کی ہوتی ہے۔

ڈیزل انجن اِس اُصول پر کام کرتا ہے کہ ہوا دبانے

سے گرم ہو جاتی ہے۔ اِس انجن میں کئی سلنڈر ہوتے ہیں' اور ہر سلنڈر کے اندر ایک ایک پسٹن لگا ہوتا ہے۔ یہ پسٹن ایک بڑے دُھرے کے ساتھ جُڑے ہوتے ہیں جسے کرینک شافٹ کہتے ہیں۔ پسٹنوں کے سلنڈر کے اندر اُوپر نیچے حرکت کرنے سے دُھرا گھومتا ہے اور یہ دُھرا دھکیلو دُھرے (Propeller Shaft) کو گھماتا ہے۔ گیس کے انجن ہوا چکّی کے اصول پر چلتے ہیں۔ انجن میں مٹّی کا تیل جلا کر گرم ہوا پیدا کی جاتی ہے جو "آندھی" بن کر دُھرے کو چلاتی ہے۔

1883ء میں ایک دُخانی سمندری جہاز نے پہلی بار بحرِاوقیانوس کو پار کیا۔ اِس جہاز کا نام سائیریس تھا۔ اِس کے انجن کو کوئلے سے چلایا جاتا تھا۔ ایک دفعہ جب جہاز پر کوئلے کا ذخیرہ ختم ہوگیا تو خشکی تک پہنچنے کے لیے جہاز کے عملے نے جہاز پر موجود لکڑی کی مُختلف چیزیں انجن میں جلائیں اور تمام فرنیچر' لکڑی کے جنگلے' حتّٰی کہ عرشے کے تختے تک اُکھاڑ کر جلادیے گئے۔

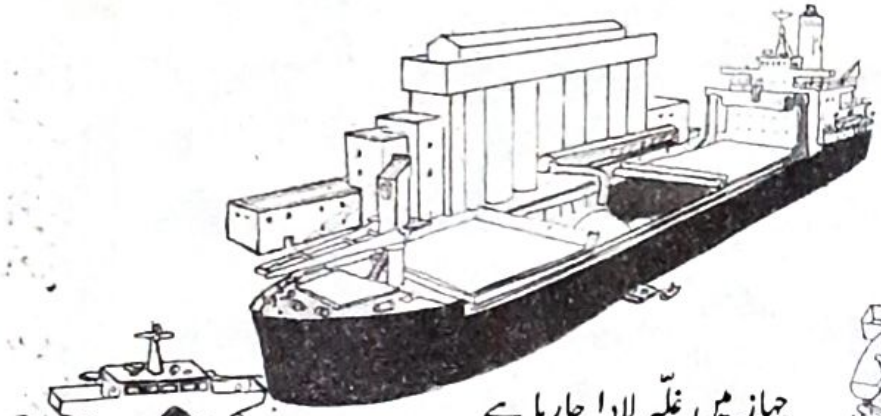

جہاز میں غلّہ لادا جارہا ہے

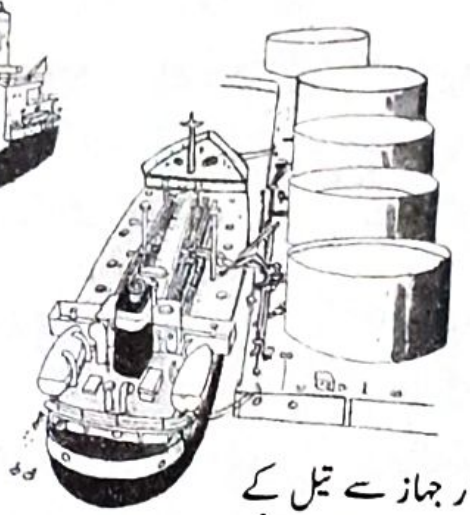

تیل بردار جہاز سے تیل کے
بڑے بڑے ڈرم ساحل پر اُتارے جارہے ہیں۔

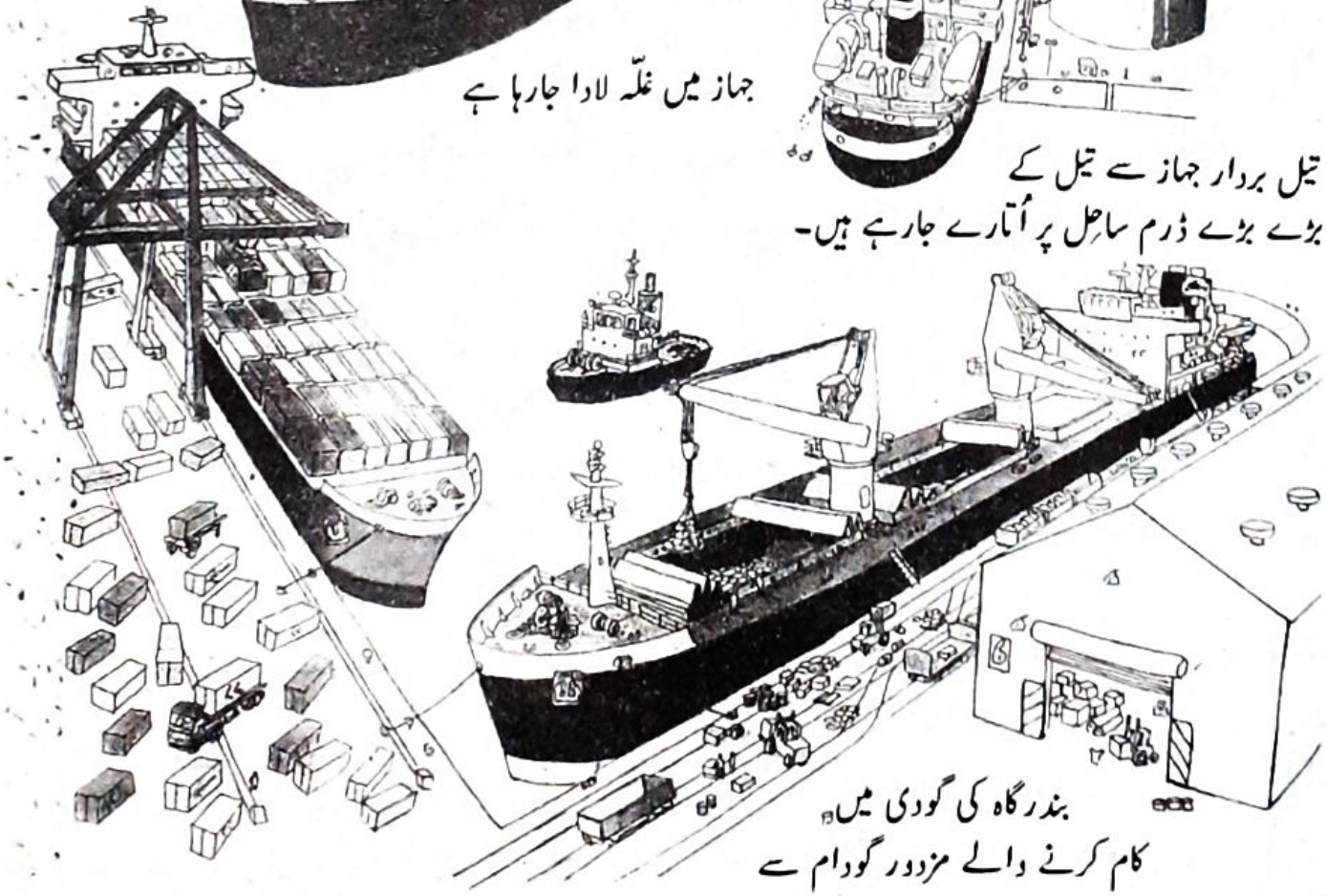

بندرگاہ کی گودی میں
کام کرنے والے مزدور گودام سے
سامان لا کر جہاز میں لاد رہے ہیں۔

جنگلی جانور بھی کھیلتے ہیں

Sharjeel Ahmed

مارگریٹ ڈی ولنگٹن

آپ نے کتّے کے پلّے کو گیند کے ساتھ کھیلتے، یا بلّی کے بچّے کو اُون کے گولے پر چھلانگ لگاتے اور اُسے پنجوں سے لُڑھکاتے دیکھا ہوگا۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ جانور بھی کھیل کُود کو پسند کرتے ہیں، کیوں کہ کھیلنے سے اُن کے جسم اور دماغ کی ورزش ہوتی ہے اور وہ خوب پھلتے پھُولتے ہیں۔

یورپ کا ایک مُلک ہے، نیدر لینڈز۔ اِسے ہالینڈ بھی کہتے ہیں۔ اِس ملک کے دارُالحکومت، ایمسٹرڈم، کے چڑیا گھر میں "ہپّو پوٹے مَس" کا ایک بچّہ تھا۔ ایک دن اُس کے تالاب میں درخت کا ایک پتّا آگرا۔ ہپّو نے پانی میں غوطہ لگایا اور جس جگہ پتّا تیر رہا تھا، اُس کے نیچے جاکر زور سے پھونک ماری۔ پتّا ہوا میں اُڑنے لگا۔

جب یہ پتّا واپس نیچے کی طرف آیا تو ہپّو نے پھر غوطہ لگایا، اور جوں ہی پتّا پانی کی سطح کے قریب آیا، اُس نے پھر زور سے پھونک ماری۔ پتّا اُچھل کر ہوا میں اُڑنے لگا۔ ہپّو یہ کھیل کافی دیر تک کھیلتا رہا، اور لوگ کھل کھلا کر ہنستے اور تالیاں بجاتے رہے۔

تقریباً تمام جنگلی جانور، چاہے چھوٹے ہوں یا بڑے، کوئی نہ کوئی کھیل ضرور کھیلتے ہیں۔ جنگلی چوہے دائرہ بنا کر ناچتے ہیں، اور پھر ایک ساتھ اِس طرح ہوا میں چھلانگ لگاتے ہیں جیسے بیلے ڈانسر چھلانگ لگاتی ہے۔ سمندری جہازوں کے ملاّحوں نے دیو جیسی وہیلوں کو دیکھا ہے، جو مداری کی طرح، سمندری گھاس کا گچھّا سر پر رکھ کر تیرتی ہیں، اور جب گچھّا پانی میں گرتا ہے تو اُسے پکڑ کر پھر سر پر رکھ لیتی ہیں۔

جنگلی جانوروں کے بعض کھیل ہمارے کھیلوں سے ملتے جُلتے ہیں۔ افریقہ کے جنگلوں میں ایک قسم کی دِیمک پائی جاتی ہے، جو اپنے رہنے کے لیے زمین کے اندر بِل بناتی ہے۔ (اِس بِل میں لاکھوں دِیمکیں رہتی ہیں)۔ بِل کھودنے سے جو مٹّی باہر نکلتی ہے، اُس سے بِل کے مُنہ پر پہاڑی سی بن جاتی ہے۔ اب شیر کے بچّوں میں مُقابلہ ہوتا ہے کہ کون پہلے، دوڑ کر، اِس پہاڑی پر چڑھتا ہے۔ جو بچّہ سب سے پہلے پہاڑی پر چڑھ جاتا ہے، وہ جیت جاتا ہے۔ شیر کے بچّوں کا یہ کھیل یورپ اور امریکا کے بچّوں کے ایک کھیل "کِنگ آف دی ہِل" (پہاڑی کا بادشاہ) سے مِلتا جُلتا ہے۔

لیکن جنگلی جانوروں کے بعض کھیل ایسے ہیں جنہیں کھیلنے کا ہم تصوّر بھی نہیں کرسکتے۔ مثلاً نوجوان ہاتھیوں کا ایک پسندیدہ کھیل آپ کھیلیں گے تو اپنا سر تُڑوا بیٹھیں

گے۔ اِس کھیل میں دو نوجوان ہاتھی حصّہ لیتے ہیں۔ دونوں آمنے سامنے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے ہیں' اور جب پندرہ بیس فٹ پیچھے ہٹ جاتے ہیں تو ایک دم دوڑ کر آگے آتے ہیں اور اِتنے زور سے ایک دوسرے کے ٹکّر مارتے ہیں کہ اُس کے دھماکے سے سارا جنگل گونج اُٹھتا ہے۔

ہاتھیوں کا ایک اور دِل چسپ کھیل کُشتی ہے۔ دو جوان ہاتھی مستک سے مستک ملا کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ (مستک ہاتھی کے ماتھے کو کہتے ہیں)۔ پھر ایک دوسرے کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو ہاتھی دوسرے ہاتھی کو پیچھے دھکیلنے میں کام یاب ہوجاتا ہے' وہ جیت جاتا ہے۔

جب بارش ہوتی ہے تو ہاتھی گولا پھینکنے کا کھیل کھیلتے ہیں۔ وہ سُونڈ سے گیلی مٹّی کے گولے بناتے ہیں اور اُنہیں اُچھال کر زیادہ سے زیادہ دُور پھینکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اِن کا یہ کھیل ایتھلے ٹِکس کے ایک کھیل "شاٹ پُٹ" سے مِلتا جُلتا ہے۔

ہاتھیوں کا ایک اور پسندیدہ کھیل ہے' تالاب میں لوٹنیاں لگانا اور سُونڈ میں پانی بھر کر ایک دوسرے پر پھینکنا۔

دوسرے جنگلی جانور بھی طرح طرح کے کھیل کھیلتے ہیں۔ چمگادڑیں عام طور پر اندھیرے غاروں اور وِیران عمارتوں میں رہتی ہیں۔ یہ جب موج میں آتی ہیں تو اِدھر اُدھر اُڑتی ہیں اور ایک دوسرے کے پر مار کر اُسے گرانے کی کوشش کرتی ہیں۔

سیہی زمین پر لوٹ پوٹ کر گیند سی بن جاتی ہے اور اِدھر اُدھر لُڑھکتی پھرتی ہے۔

اُود بِلاؤ (Beaver) جاپانی کُشتی لڑتے ہیں۔ دو اُود بِلاؤ مُنہ سے مُنہ اور جسم سے جسم ملا کر کھڑے ہوجاتے ہیں' اور پھر ایک دوسرے کو دھکیل کر گرانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک امریکی ماہرِ حیوانات' ڈیان فوسّی' تیرہ سال یوگنڈا کے جنگلوں میں گوریلوں کے درمیان رہی تھی۔ (یوگنڈا افریقہ کا ایک مُلک ہے)۔ اُس کا کہنا ہے کہ گوریلوں کے بچّے' انسانوں کے بچّوں کی طرح' قِسم قِسم کے کھیل کھیلتے ہیں۔ اُن کا ایک دل چسپ کھیل ہمارے فٹ بال سے ملتا

جُلتا ہے۔ ایک گوریلا زمین پر گرے ہوئے پھل کو کِک لگاتا ہے۔ سارے گوریلے اُس کے پیچھے دوڑتے ہیں' اور جو پہلے پھل کے پاس پہنچ جاتا ہے' وہ اُسے کِک لگاتا ہے۔ یہ کھیل کافی دیر تک جاری رہتا ہے اور جنگل کھلاڑیوں کی چیخوں سے گونج اُٹھتا ہے۔

بندروں میں سب سے زیادہ کِھلنڈرے بندر چمپانزی ہیں۔ اِن کی اکثر عادتیں انسانوں سے ملتی جُلتی ہیں۔ اِن کا ایک دل چسپ کھیل گُدگُدی ہے۔ چمپانزی کے بچّے ایک دوسرے کی ٹھوڑی کے نیچے یا پیٹ میں پا پیروں میں ہاتھوں سے گُدگُدی کرتے ہیں' اور جس کے گُدگُدی کی جاتی ہے' وہ چیخ چیخ کر سارا جنگل سر پر اُٹھالیتا ہے۔

ایک انگریز ماہرِ حیوانات' جین گُڈ آل' نے تنزانیہ کے جنگلوں میں گھوم پھر کر چمپانزیوں کی عادتوں کا مُطالعہ کیا تھا۔ (تنزانیہ بھی افریقہ کا ایک ملک ہے)۔ اُس کا کہنا ہے کہ بڑے چمپانزی بھی اپنے بچّوں کے ساتھ کھیل کُود میں شریک ہوتے ہیں۔ بچّے اُن پر چھلانگیں لگاتے اور اُن کی گردن کو دانتوں سے گُدگُداتے ہیں تو وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔

بعض جنگلی جانور اپنے بچّوں کے ساتھ کھیلتے کُودتے ہیں تو بعض اُنہیں خاموشی سے کھیلتا ہُوا دیکھتے ہیں' اور کسی حد تک اُن کی شوخیاں اور شرارتیں برداشت کرتے ہیں۔

گینڈے کے بچّے اپنی ماں کے گِرد چکّر لگاتے ہیں' اور پھر اچانک اُس کے پہلو میں زور سے ٹکّر مارتے ہیں۔ ان کی ماں دو تین بار تو اُن کی یہ شوخی چُپ چاپ سَہ لیتی ہے' لیکن جب وہ حد سے بڑھتے ہیں تو غُرا کر اُنہیں خبردار کرتی ہے۔ بچّے سہم کر بیٹھ جاتے ہیں اور کھیل ختم ہو جاتا ہے۔

سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ حیوانوں کے بچّوں میں کھیل کُود کی جِبلّت (حیوانی عقل) قُدرت کی طرف سے دی گئی ہے۔ کھیل کُود سے اُن کے پٹھّے مضبوط ہوتے ہیں' جسم میں چُستی اور پھُرتی آتی ہے' اور دماغ کی نشوونما ہوتی ہے۔ اور جب وہ جوان ہوتے ہیں تو اُنہیں خوراک حاصل کرنے اور اپنے آپ کو دشمنوں سے بچانے کے لِیے اِنہی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ کھیل کُود سے جانوروں کو اپنے ماحول سے واقِف ہونے اور اپنے خاندان کے دوسرے جانوروں سے دوستی کرنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ بہرحال' کھیل کُود کا یہ مقصد بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ بعض وقت جانور صرف تفریح کے لِیے بھی کھیلتے ہیں۔ جسم اور دماغ کو چاق چوبند رکھنے کے لِیے تفریح بھی ضروری ہے۔ (ترجمہ: س۔ل)

Sharjeel Ahmed

دِل چسپ اور عجیب

○ جُنوبی ہندوستان کی ایک مُسلم رِیاست' حیدر آباد دکن' کے نوّاب میر محبوب علی خان کی رائٹنگ ٹیبل کا پیپر ویٹ 4 کروڑ روپے کا تھا۔ یہ ایک بہُت بڑا ہیرا تھا۔

○ گز کا پیمانہ انگلینڈ کے ایک بادشاہ' ہنری اوّل' نے اِیجاد کیا تھا۔ اُس نے اُس کی لمبائی اپنی ناک سے اپنے پھیلے ہوئے بازو کے انگوٹھے تک مُقرّر کی تھی۔

○ "البیٹ راس" دُنیا کا واحِد پرندہ ہے جو پر ہِلائے بغیر سارا دِن ہَوا میں اُڑ سکتا ہے۔

○ رُوس کی ایک مِلکہ "انّا" نے ایک ایسا محل بنوایا تھا جس کی ساری دیواریں' چھتیں اور سُتون برف کے تھے۔ برف کا یہ محل جو 1739ء کے موسِم سرما میں بنوایا گیا تھا' 80 فٹ لمبا' 23 فٹ چوڑا اور 32 فٹ اُونچا تھا۔ اِس کی ہر چیز برف کی تھی' یہاں تک کہ اِس میں جو مُجسّمے رکھے گئے تھے' وہ بھی برف کے تھے۔

○ بنگلہ دیش (سابق مشرقی پاکستان) کے پڑوس میں ایک مُلک ہے' برما۔ اِس کی آبادی 3 کرڑ 30 لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ یہاں ہر سال 5,000 کے قریب لوگ سانپوں کے ڈسنے سے مرتے ہیں۔

○ لندن کی پولیس نے 1870ء میں سیٹی اِستعمال کرنا شروع کی۔ اِس سے پہلے وہ لکڑی کے جھنجھنے بجا کر ٹریفک کو کنٹرول کرتی تھی۔

○ یوگنڈا افریقہ کا ایک مُلک ہے۔ اِس کے ایک بادشاہ' موٹیسا' کی 7,000 بیویاں تھیں۔

○ ناروے شمالی یورپ کا ایک مُلک ہے۔ اِس کے ایک بادشاہ نے اپنے ایک چہیتے کُتّے کو ایک صُوبے کا گورنر مُقرّر کیا تھا۔

○ ملکہ وکٹوریا کے زمانے میں لندن کے حجّام لوگوں کے بال اور ناخُن کاٹنے کے عِلاوہ اُن کے دانت بھی صاف کیا کرتے تھے۔

○ فرانس کے ایک گاؤں کا نام Y ہے۔ فرانسیسی زبان میں Y کا مطلب ہے "وہاں"۔ شمالی یورپ کے ایک مُلک ڈنمارک کے ایک گاؤں کا نام "A" ہے۔

○ امریکا کی ایک دولت مند عورت' ہن رِیٹا گرین' اِتنی کنجُوس تھی کہ کسی وقت اُس کی کافی یا دلیہ ٹھنڈا ہو جاتا تو اُسے دوبارہ گرم نہیں کرواتی تھی کہ گیس خرچ ہوگی۔ یہ کنجوس مکھّی چُوس بُڑھیا 9 کروڑ 50 لاکھ ڈالر چھوڑ کر مری۔

○ پُرانے زمانے کے امریکی بہُت حیا دار اور شرمیلے ہوتے تھے۔ اُن کی عورتیں ایسے کمرے میں کپڑے نہیں بدلتی تھیں جس میں کسی مرد کی تصویر ہوتی تھی۔ وہ زنانہ اور مردانہ کپڑے الگ الگ دھوتی تھیں' اور اُنہیں سُوکھنے کے لِیے الگ الگ لٹکاتی تھیں۔

○ پُرانے وقتوں کے انگریز دندان ساز (ڈینٹسٹ) نوکیلی ٹوپیاں پہنتے تھے' اور اُن کے گلے میں اُن دانتوں کا ہار ہوتا تھا جو اُنہوں نے مریضوں کے نکالے ہوتے تھے۔ جس ڈاکٹر کے ہار میں جتنے زیادہ دانت ہوتے تھے' وہ اُتنا ہی زیادہ تجربہ کار سمجھا جاتا تھا۔

○ چند سال ہوئے' چین کی قومی فُٹ بال ٹیم یُونان کی فُٹ بال ٹیم سے میچ کھیلنے ایتھنز گئی۔ (ایتھنز یُونان کا دارُالحکومت ہے) میچ شروع ہونے میں چند مِنٹ تھے کہ لاؤڈ اِسپیکر پر میوزک بجنے لگا۔ چینی کھلاڑی سمجھے کہ یونان کا قومی ترانہ بجایا جارہا ہے۔ وہ اُس کے اِحترام میں کھڑے ہوگئے۔

یُونانی کھلاڑیوں اور تماشائیوں نے خیال کیا کہ چین کا قومی ترانہ بج رہا ہے۔ وہ بھی کھڑے ہوگئے۔ اِتنے میں میوزِک ختم ہوگیا اور ایک عورت کی آواز آئی "ہیلن ٹُوتھ پیسٹ۔ دانتوں کو چمکائے' مسوڑوں کو مضبوط بنائے۔ ہمیشہ ہیلن ٹوتھ پیسٹ اِستعمال کیجیے"۔ اصل میں یہ ٹُوتھ پیسٹ کا اِشتہار تھا اور اِس سے پہلے جو میوزِک بجا تھا' وہ اِسی اِشتہار کا حِصّہ تھا۔ (س۔ل)

Sharjeel Ahmed

باتیں بڑوں کی

مرسلہ: ثمرہ رشید، راول پنڈی

☆ مظلوم کی بد دُعا سے بچو، کیوں کہ اُس کی بد دُعا شُعلے کی طرح آسمان پر جاتی ہے۔ (حضرت محمدؐ ﷺ)

☆ لالچ، کنجوسی اور ایمان، کبھی ایک دل میں جمع نہیں ہوسکتے۔ (حضور پاک ﷺ)

مرسلہ: محمدؐ شہزاد، چک EB - 155 ضلع ساہی وال

☆ وہ بدبخت ہے جس نے والدین کو بُڑھاپے کی حالت میں پایا اور اُن کی خدمت کرکے جنّت حاصل نہ کی۔ (حضرت محمدؐ ﷺ)

مرسلہ: عدیل ستّار، گلشنِ اقبال کراچی

☆ سچّائی کی مشعل جہاں بھی دکھائی دے، اُس سے فائدہ اُٹھاؤ۔ یہ نہ دیکھو کہ مشعل اُٹھانے والا کون ہے۔ (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا)

مرسلہ: عُمردین قمر کھوکھر، چک L - 142 ضلع ساہی وال

☆ مصیبتوں کا مقابلہ صبر سے، اور نعمتوں کی حفاظت شُکر سے کرو۔ (حضرت علیؓ)

☆ غصّے کا بہترین علاج خاموشی ہے۔ (حضرت عثمان غنیؓ)

مرسلہ: الیف، زیڈ نصرت حسین، کوہاٹ

☆ گناہوں پر شرمندہ ہونا، اُن کو مٹادیتا ہے، اور نیکیوں پر غرور کرنا اُن کو برباد کردیتا ہے۔ (حضرت علیؓ)

مرسلہ: ثمینہ سعید مغل، رائے ونڈ

☆ سب کو خوش کرنا بہت مشکل ہے۔ اِس لیے بس خدا سے اپنا مُعاملہ رکھو، اور کسی کی بے جا خوشی اور ناخوشی کی پروا نہ کرو۔ (حضرت اِمام شافعیؒ)

مرسلہ: شبانہ کوثر مغل، فیصل آباد

☆ پاؤں پھسل جائے تو پھسل جائے، زبان کو نہ پھسلنے دو۔ (عبرانی)

مرسلہ: اے حمید خالد، عبدالحکیمؒ

☆ وہ گھر جس میں (اچھّی) کتابیں نہ ہوں، اُس جسم کی مانند ہے جس میں رُوح نہ ہو (سقراط)

☆ اپنے بٹوے کو پیسوں سے بھرنے کے بجائے، اپنی الماری کتابوں سے بھرو۔ (جان سلی)

مرسلہ: فائزہ خان، خان گڑھ

☆ ہر نئی چیز اچھّی معلوم ہوتی ہے۔ مگر دوستی جتنی زیادہ پُرانی ہو، اُتنی ہی عُمدہ اور مضبوط ہوتی ہے۔ (ارسطو)

☆ اُونچے پہاڑ پر چڑھنے کے لیے آہستہ آہستہ چلنا چاہیے۔ (شیکسپیئر)

مرسلہ: رابعہ اِفتخار، گوال منڈی لاہور

☆ طاقت ور وہ ہے جو غصّے کو پی جائے۔ (جُنید بغدادیؒ)

☆ اِتنا کھاؤ جتنا ہضم کرسکو، اور اِتنا پڑھو جتنا جذب کرسکو۔ (بُوعلی سینا)

مرسلہ: اِمتنانُ الرّحمان، فیصل آباد

☆ جو خدا سے ڈرتا ہے، اُس سے سب ڈرتے ہیں۔ (حسن بصریؒ)

☆ جب قوم سوتی ہے تو لیڈر جاگتا ہے۔ (قائدِاعظمؒ)

مرسلہ: محمدؐ زعفران خان، ٹیکسلا کینٹ

☆ وہ لوگ کبھی تنہا نہیں ہوتے جن کے دماغ میں خوب صورت خیالات ہوتے ہیں۔ (نامعلوم)

☆ عظیم خیالات جب عمل کے سانچے میں ڈھلتے ہیں تو عظیم تخلیقات کا درجہ حاصل کرلیتے ہیں۔ (نامعلوم)

محمد ادریس قریشی

دھماکے کی واپسی

Sharjeel Ahmed

جیپ ایک زور دار جھٹکے کے ساتھ رُک گئی۔ ہم تینوں اُچھل کر ایک دوسرے پر گرے۔ میرے مُنہ سے ایک دم نکلا "کک ..... کیا ہُوا' انکل؟"

مگر میرے سوال کا جواب مجھے خود ہی معلوم ہوگیا۔ سڑک پر ایک بہت موٹا درخت گرا پڑا تھا' جس سے آگے جانے کا راستہ بند ہوگیا تھا۔

انکل چھلانگ مار کر نیچے اُترے۔ میں' کاشف اور نوید بھی نیچے اُتر آئے اور حیرت سے درخت کو دیکھنے لگے۔

ہم تینوں دوست میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہو چکے تھے اور ہمارا زیادہ وقت انکل کے پاس ہی گزرتا تھا۔ انکل ہمارے محلّے کی دل چسپ شخصیت تھے۔ وہ ایک ریٹائرڈ فوجی تھے اور پورے محلّے کے انکل تھے۔

ایک دن بیٹھے بٹھائے ہمارا پک نک منانے کا پروگرام بن گیا۔ کاشف نے کہا "لیکن پک نک کے لیے کہاں جایا جائے؟"

انکل نے کہا "بھئی' میرے ذہن میں ایک بڑی خوب صورت جگہ ہے۔ یہ ایک پہاڑی علاقہ ہے اور پہاڑیاں سبزے سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ وہاں کا موسم بہت سہانا ہوتا ہے"۔

نوید نے کہا "انکل' کیا وہاں شکار بھی ملتا ہے"۔

انکل نے کہا "ہاں۔ میں اپنی بندوق لے چلوں گا۔ ہم پرندوں کا شکار کریں گے اور وہیں پر اُنہیں بھون کر کھائیں گے"۔

بس پھر کیا تھا۔ ہم چند دن بعد یہاں آگئے۔ لیکن اب یہ درخت ہمارا راستہ روکے ہوئے تھا۔

میں نے کہا "انکل' ہم چاروں زور لگائیں تو شاید یہ ہٹ جائے..."

انکل نے کہا "آؤ' دیکھتے ہیں۔"

ہم چاروں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تو درخت اپنی جگہ سے ذرا سا ہلا۔ ہم نے اُسے چھوڑا تو وہ پھر اپنی پہلی جگہ پر آگیا۔

"یہ مسئلہ ایسے حل نہیں ہوگا" نوید بولا۔

"تو پھر کیا کریں؟" میں نے پریشان ہو کر کہا۔

یہ ایک پتلی سی سڑک تھی اور اِس کے دونوں طرف

لمبے لمبے درخت تھے۔ اِس لیے سڑک سے نیچے اُتر کر بھی جیپ کو آگے نہیں لے جایا جاسکتا تھا۔

کاشِف بولا "میرا خیال ہے، ہم یہاں بیٹھ کر اِنتظار کریں۔ شاید کوئی کار وغیرہ اِس طرف آجائے۔ پھر ہم کار والوں کے ساتھ مِل کر اِس درخت کو ہٹانے کے لیے زور لگائیں گے۔"

ہم اُس درخت پر ہی بیٹھ گئے۔ مگر آدھا گھنٹا گزر گیا اور دور دور تک کوئی بھی آتا دکھائی نہ دیا۔ میں نے تنگ آکر کہا "اب کیا کریں؟"

انکل نے کہا "بھئی، یہ سڑک کسی شہر کو نہیں جاتی۔ اس لیے اِس پر ٹریفک نہیں چلتی۔ کوئی سیر و تفریح کرنے والا ہی اِس طرف آسکتا ہے"۔

"پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" نوید نے بے چینی سے کہا۔

انکل بولے "میرا خیال ہے، ہم اپنا سامان اُٹھالیں اور جیپ کو یہیں چھوڑ کر پیدل چلیں۔ ویسے بھی ذرا سا ہی فاصلہ رہ گیا ہے"۔

ہم نے اپنا سامان اُٹھایا اور درخت پھلانگ کر آگے چل پڑے۔ ہمیں آدھ گھنٹے تک چلنا پڑا۔ آخر انکل بولے "لو، وہ جگہ آگئی۔"

چاروں طرف بہت حسین منظر تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سرسبز میدان کے تین طرف چھوٹی چھوٹی سبزے سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں تھیں۔ ایک ندی بھی بہ رہی تھی۔ اِتنا سُہانا منظر دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ ہم نے گھاس پر کپڑا بچھایا اور بیٹھ گئے۔

"میرا خیال ہے، پہلے کھانا کھالیا جائے۔ پھر پرندوں کا شکار کریں گے" انکل نے کہا۔

درختوں پر بہت خوب صورت رنگ برنگ پرندے چہچہا رہے تھے۔

میں نے کہا "انکل، میرے خیال میں پرندوں کا شکار نہ کیا جائے۔ گھر سے لایا ہُوا کھانا کافی ہے۔ ہم یہاں گھوم پھر کر تصویریں اُتاریں گے"۔

کاشِف بولا "بالکل ٹھیک۔ اِن معصوم پرندوں کی جان لینے سے کیا فائدہ؟"

ہم نے کھانا کھایا اور کھانے کے بعد اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے۔ چند تصویریں بھی اُتاریں۔

اچانک ایک زور دار آواز گُونجنے لگی "دگڑ دگڑ دگڑ دگڑ!" ہم حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ پھر ہم نے دیکھا کہ ایک آدمی گھوڑے پر سوار تیزی سے ہماری طرف آرہا ہے۔ وہ ہمارے پاس آکر رُک گیا اور تیز آواز میں بولا "کون ہو تم اور یہاں کیا کرنے آئے ہو؟"

ہم نے کہا "ہم یہاں سیر کرنے آئے ہیں۔ آپ کو کوئی اِعتراض ہے؟"

اس آدمی نے میری بات کا جواب دینے کی بجائے ایک عجیب حرکت کی۔ اُس نے پستول نکالا اور ٹھائیں ٹھائیں ٹھائیں تین ہوائی فائر کردیے۔ فائر کی آواز سے پہاڑیاں گونج اُٹھیں۔ ہم ابھی حیرت سے اُس آدمی کو دیکھ ہی رہے تھے کہ اور بہت سے آدمی بھاگتے ہوئے آگئے۔ دوسرے ہی لمحے ہم چاروں اُن آدمیوں کے گھیرے میں تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور وہ شکلوں سے خطرناک نظر آرہے تھے۔

گھڑسوار نے اُن آدمیوں سے کہا "اِن چاروں کو پکڑ کر ڈیرے پر لے چلو"۔

وہ ہماری طرف بڑھے تو انکل نے تیزی سے کہا "خبردار! ٹھہر جاؤ!"

یہ سُن کر ایک آدمی نے فائر کیا۔ گولی انکل کے کندھے کے قریب سے گزر گئی۔ اُس نے گرج کر کہا "ہمارے ساتھ چلو! چُپ چاپ!"

وہ بدمعاش ہمیں اسلحے کے زور پر ایک طرف لے چلے۔ گھڑسوار آگے نکل کر پہاڑیوں میں غائب ہوگیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ لوگ اِن پہاڑیوں میں کوئی غیر قانونی کام کررہے ہیں اور گھڑسوار اِن کا سردار ہے۔

تھوڑی دُور چلنے کے بعد وہ ہمیں ایک پہاڑی غار کے

پاس لائے اور ہمیں اندر گھسنے کو کہا۔ غار میں لال ٹین جل رہی تھی۔ اُس کی روشنی میں ہم چلتے رہے۔ غار آگے جاکر ایک بڑے سے ہال کمرے میں تبدیل ہوگیا۔ وہاں کا منظر دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہم کسی پُرانے زمانے کے بادشاہ کے دربار میں آگئے ہیں۔ ہال میں ایک بڑا سا تخت بِچھا ہُوا تھا اور اُس پر وُہی گھُڑسوار گاوٴ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

بدمعاشوں نے بلند آواز سے کہا "اُستاد! یہ آگئے ہیں۔"

اُستاد نے ہم سے کہا "تخت کے پاس زمین پر بیٹھ جاوٴ۔ اگر کوئی غلط حرکت کی تو نتیجے کے ذِمّے دار تم ہوگے"۔

ہم چاروں زمین پر دھرنا مار کر بیٹھ گئے۔ بدمعاش پتھریلی دیواروں کے ساتھ پتّھر کے بنچوں پر بیٹھ گئے۔ انکل نے تخت پر بیٹھے ہوئے اُستاد سے کہا "ہاں بھئی، اب بتاوٴ۔ ہمیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟ ہم تو سیر کرنے آئے ہیں۔ سیر کرکے واپس چلے جائیں گے"۔

اُستاد نے قہقہہ لگایا اور بولا "لیکن ہم نہیں چاہتے کہ یہاں کوئی سیر کرنے آئے۔ اِس لیے ہم نے اِس سڑک پر ایک درخت کاٹ کر ڈال دیا ہے"۔

نوید بولا "لیکن یہ تو بتاوٴ کہ تم اِس جگہ کیا کررہے ہو اور اب ہمارے ساتھ کیا سلوک کروگے؟"

اُستاد نے دانت نکالتے ہوئے کہا "تمہیں تو اب یہیں دفن کردیا جائے گا۔ اگر ہم نے تمہیں چھوڑ دیا تو تم پولیس کو ہمارے اڈّے پر لے آوٴ گے۔ اور رہ گئی یہ بات کہ ہم یہاں کیا کررہے ہیں، تو یہ ایک لمبی کہانی ہے"۔

انکل نے کہا "مسٹر اُستاد، میرا خیال ہے تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ اگر تم ہمیں یہاں نہ لاتے تو ہم پک نِک مناکر واپس چلے جاتے۔ ہماری جیپ یہاں سے کچھ فاصلے پر سڑک پر کھڑی ہے اور ہمارے گھر والوں کو بھی عِلم ہے کہ ہم اِس طرف آئے ہیں۔ اگر ہم اپنے گھر واپس نہ گئے تو پولیس ہمیں تلاش کرتی ہوئی یہاں آجائے گی اور یہ غار آسانی سے ڈھونڈ لے گی"۔

اُستاد نے حلق پھاڑ کر قہقہہ لگایا اور پھر بولا "نہیں، پولیس اِس غار تک نہیں پہنچ سکتی۔ غار کے مُنہ پر ایک بہُت بڑا پتّھر رکھ دیا جاتا ہے۔ تمہاری جیپ کو بھی ہم غائب کردیں گے۔ اور ہاں، میرا دماغ خراب نہیں ہُوا۔ یہاں پک نِک منانے والے جب اپنے گھروں کو واپس نہیں جائیں گے تو لوگ خوف زدہ ہوجائیں گے اور اِس جگہ آنا چھوڑ دیں گے۔ اِس طرح ہم یہاں اپنا کام آرام سے جاری رکھ سکیں گے"۔

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ ہم سمجھ گئے۔ لیکن تم لوگ یہاں کیا کررہے ہو؟ یہ تو ہمیں بتادو۔"

اُستاد نے کہا "سُننا ہی چاہتے ہو تو سُنو۔ لیکن تم تینوں تو بچّے ہو۔ تمہیں بھلا کیا معلوم۔ ہاں، یہ بُزرگ ضرور حیرت اور خوف کے مارے اُچھل پڑیں گے، جب میں اِنہیں اپنا نام بتاوٴں گا۔ سُنو! میرا نام دھماکا ہے۔"

"دھماکا! ارے باپ رے!" انکل کی آنکھیں خوف کے مارے پھیل گئیں۔ اُن کا جسم تھر تھر کانپنے لگا۔ ہم تینوں اُن کی یہ حالت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ بھلا کسی آدمی کا نام دھماکا ہے تو اِس سے انکل کو اِتنا خوف زدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے؟

دھماکے نے پھر ایک قہقہہ لگایا اور بولا "کیوں؟ میں نے ٹھیک کہا تھا ناں کہ تم میرا نام سُن کر ہی تھر تھر کانپنے لگو گے"۔

ایک مِنٹ بعد انکل کی حالت کچھ سنبھلی تو اُنھوں نے کہا "تو ... تم ہو دھماکا، جسے پورے ملک کی پولیس پندرہ سال سے تلاش کرتی پھِر رہی ہے"۔

"ہاں۔ اور اب پندرہ سال بعد میں ایک بار پھر اپنا کام شروع کرنے والا ہُوں۔ اور اِس کی ایک وجہ ہے۔ دراصل یہ وجہ میری کم زوری ہے، بہُت بڑی کم زوری" دھماکے نے کہا۔

انکل بولے "میں وہ وجہ سُننا چاہتا ہوں، مسٹر دھماکا"۔

دھماکے نے جواب دیا "وہ وجہ ہے شہرت حاصل کرنا۔ میں بچپن ہی سے چاہتا تھا کہ پورے ملک میں میرا نام

مشہور ہوجائے۔ اور جب شُہرت حاصِل کرنے کا کوئی اور طریقہ سمجھ میں نہیں آیا تو میں نے یہ راستہ اِختیار کرلیا۔ میں نے شہر میں دھڑا دھڑ ڈاکے ڈالے اور جہاں بھی ڈاکا ڈالا وہاں ایک کارڈ ضرور پھینک دیا، جس پر لکھا ہوا تھا: میرا نام دھماکا ہے۔ پولیس میری گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتی۔

"اور ہُوا بھی یہی۔ پولیس مجھے کبھی گرفتار نہیں کرسکی۔ اور تو اور کوئی میری شکل تک سے واقف نہ تھا۔ میرا نام سُن کر ہی بڑے بڑے سیٹھ اور پولیس افسر خوف زدہ ہوجاتے تھے۔ اور پھر میرے پاس بے تحاشا دولت جمع ہوگئی۔ میں نے سوچا کہ اب ڈاکے ڈالنا چھوڑ دینا چاہیئے اور باقی زندگی آرام سے گزارنا چاہیئے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو اُن کا حصّہ دے کر فارِغ کردیا اور خود مزے سے زندگی گزارنے لگا۔ میرا نام ملک کے تمام اخباروں میں چھپتا رہا۔ مجھے گرفتار کرنے والے کو اِنعام دینے کے اِشتہار دیے جاتے رہے۔ پولیس نے میرا خیالی خاکہ بنا رکھا تھا جو میری شکل سے بالکل مُختلِف تھا۔ اِس خاکے کو دیکھ دیکھ کر میں ہنسا کرتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اخبارات میں میرا نام چھپنا بند ہوگیا۔ سال پر سال گزرتے گئے اور لوگ میرا نام بھی بھول گئے۔ آج پندرہ سال بعد لوگوں کو یاد بھی نہیں رہا کہ کبھی کوئی دھماکا نام کا ڈاکو ہُوا کرتا تھا۔ صرف پُرانے لوگوں کے ذِہن میں ہوگا، جیسے تمہارے ذِہن میں تھا۔" دھماکا ڈاکو یہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔

نوید نے کہا "تو پھر دھماکا صاحِب، اب تُمہیں دوبارہ میدان میں آنے کی کیا ضرورت پڑگئی؟"

دھماکے نے جواب دیا "میں نے بتایا ناں کہ شُہرت میری بہت بڑی کمزوری ہے، اور شُہرت حاصِل کرنے کی میری یہ خواہش پھر اُبھر آئی ہے۔ میں نے ایک نیا گروہ بنالیا ہے اور اب ہم وارداتیں کریں گے، اور جہاں ڈاکے ڈالیں گے، وہاں ایک کارڈ ضرور پھینکیں گے، جس پر لکھا ہوگا: پندرہ سال بعد دھماکے ڈاکو کی واپسی۔ اِس طرح میرا بھُولا ہُوا نام پھر مشہور ہوجائے گا۔"

انکل نے کہا "مسٹر دھماکا، مجھے افسوس ہے کہ تم نے شُہرت حاصل کرنے کے لیے اک غلط راستے کا اِنتخاب کیا ہے۔"

میں نے جلدی سے کہا "دھماکا صاحِب، کیا تمہارے ماں باپ نے تمہارا نام دھماکا رکھا تھا؟"

دھماکے نے کہا "نہیں۔ اُنہوں نے میرا نام شرافت علی رکھا تھا"۔

کاشِف بولا "تُم میں چُوں کہ شرافت نہیں تھی، اِس لیے تم نے اپنا نام بدل لیا"۔

دھماکا جُھنجلا کر بولا "بہت باتیں ہوچکیں۔ اب تُمہیں زندہ دفن کرنے کا پروگرام شروع کیا جاتا ہے۔ بچّے، شیدے، سامی، گوگے، اِن کو باندھ دو اور گڑھا کھودنا شروع کردو"۔

موٹے تازے بدمعاشوں نے ہمیں رسّیوں سے کس کر باندھ دیا اور پھر کئی بدمعاش کُدالوں سے پتھریلی دیوار کے قریب گڑھا کھودنے لگے۔

ہم بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے کہ اچانک میرے مُنہ سے نکلا "مسٹر دھماکا، میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہُوں اور وہ بات تمہارے فائدے کی ہے"۔

"ہاں ہاں، بولو۔ اب تو تم چند لمحوں کے مہمان ہو" دھماکے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا "مسٹر دھماکا، زندگی اور موت صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ میں تم سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ شُہرت حاصل کرنے کا جو طریقہ تُم نے اِختیار کیا ہے وہ بہت خطرناک ہے۔ تمہیں ہر لمحہ یہی دھڑکا لگا رہے گا کہ اب پولیس آئی کہ آئی۔ اور اگر تم پولیس کے ہتھّے چڑھ گئے تو سمجھو کہ گئے دس پندرہ سال کے لیے۔"

"لیکن اِس میں میرے فائدے کی کیا بات ہے؟" دھماکے نے آنکھیں گھُمائیں۔

"وہی تو بتارہا ہُوں" میں بولا "تم نے اپنا نام دھماکا رکھا ہے۔ اِس طرح شُہرت تو دھماکا ڈاکو کی ہوئی، تمہاری تو نہیں ہوئی ناں؟ تمہیں تو کوئی نہیں جانتا۔ مزہ تو تب تھا کہ

تم اپنے اصل نام' شرافت علی' سے مشہور ہوتے اور لوگ تمہاری عزّت کرتے۔ تمہیں بددُعائیں نہ دیتے' دُعائیں دیتے۔ تمہارا نام سُن کر تھر تھر نہ کانپتے' تم سے ملنے کی آرزُو کرتے۔ مسٹر دھاکا' تم شُہرت حاصِل کرنے میں بِالکُل ناکام رہے ہو"۔

دھاکا سوچ میں گُم ہوگیا۔ پھر اُس نے کہا "لیکن اپنے اصل نام کے ساتھ میں کس طرح شُہرت حاصل کرسکتا ہوں؟"

انکل جلدی سے بولے "مسٹر دھاکا، تُم مجھے کاغذ قلم منگوادو۔ میں تمہیں ایک منصُوبہ بنا کردیتا ہوں۔"

دھاکے نے اپنے ایک ساتھی سے کاغذ قلم لانے کو کہا۔ ایک مِنٹ بعد وہ کاپی اور قلم لے آیا۔

انکل چند مِنٹ کچھ لکھتے رہے۔ پھر بولے "یہ لو' مسٹر دھاکا۔ ہمیں دفن کرنے سے پہلے اِس پر ذرا غور کرلو۔ میرے اِس منصوبے پر عمل کرکے تم شہرت بھی حاصل کرسکتے ہو اور اپنے گناہوں کی تلافی بھی کرسکتے ہو۔" دھاکے نے کاغذ پر نظریں دوڑائیں۔ وہ کافی دیر اُس پر لِکھی ہوئی تحریر پڑھتا رہا۔ پھر اُس نے بلند آواز سے کہا "میں آپ کو آزاد کرتا ہُوں۔ لیکن آپ وعدہ کریں کہ پولیس کو ہمارے بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے۔ مِیں آپ کے منصوبے پر عمل کروں گا' لیکن کچھ وقت تو لگے گا ہی نا"۔

انکل نے کہا "ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمہارے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد ہم اپنی جیپ میں بیٹھے واپس جارہے تھے۔ انکل نے ہم سے وعدہ لیا تھا کہ ہم کسی کو اِس واقعے کے بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے۔

ایک ماہ بعد ہم اخبار پڑھ رہے تھے کہ ایک خبر پڑھ کر چونک اُٹھے۔ لکھا تھا:

"ملک کے مشہور ڈاکو دھاکا نے اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کردیا ہے۔ اُس نے عہد کیا ہے کہ اپنے کِیے کی سزا بُھگتنے کے بعد شرافت کی زندگی بسر کرے گا' کیوں کہ اُس کا نام شرافت علی ہے"۔

یہ خبر پڑھ کر ہم مسکرا دیے۔ انکل کا منصُوبہ کامیاب رہا تھا!

****

دُنیا کا سب سے بڑا شہر---ٹوکیو

اقوامِ مُتّحِدہ نے دُنیا کے 15 بڑے شہروں کی فہرست شائع کی ہے۔ اِس فہرست کے مُطابِق' جاپان کا شہر ٹوکیو دُنیا کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اِس کی آبادی 2 کروڑ 65 لاکھ ہے۔ امریکا کا شہر نیو یارک دُنیا کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ اِس شہر میں ایک کروڑ 63 لاکھ اِنسان بستے ہیں۔ دوسرے بڑے شہر یہ ہیں (دائیں جانِب شہر کا نام اور اُس کے آگے بریکٹ میں ملک کا نام ہے)۔

ساؤ پالو (برازیل) : ایک کروڑ 61 لاکھ
میکسیکو شہر (میکسیکو) : ایک کروڑ 55 لاکھ
شنگھائی (چین) : ایک کروڑ 47 لاکھ
بمبئی (بھارت) : ایک کروڑ 45 لاکھ
لاس انجیلیز (امریکا) : ایک کروڑ 22 لاکھ
بیجنگ (چین) : ایک کروڑ 20 لاکھ
کلکتّہ (بھارت) : ایک کروڑ 15 لاکھ
سول (جنوبی کوریا) : ایک کروڑ 14 لاکھ
جکارتا (انڈونیشیا) : ایک کروڑ 10 لاکھ
بوئنوز آئرز (ارجنٹینا) : ایک کروڑ 9 لاکھ
اوساکا (جاپان) : ایک کروڑ 6 لاکھ
ریو ڈی جنیرو (برازیل) : 98 لاکھ
کراچی (پاکستان) : 89 لاکھ

برّاعظم ایشیا اور برّاعظم افریقہ کے 70 فی صد لوگ دیہات میں اور 30 فی صد شہروں میں رہتے ہیں۔ برّاعظم یورپ اور برّاعظم شمالی امریکا کے 70 فی صد لوگ شہروں میں آباد ہیں۔

حفیظ الرّحمٰن احسن

کوّے رے کوّے

کوّے رے کوّے پر تیرے کالے
رگڑے ہوں جیسے کالے توے سے
آنکھیں ہیں تیری پُھرتیلی کیسی

دُشمن سے اپنے ہُشیار ہے تُو
غُلّے سے کتنا بیزار ہے تُو

کر کائیں کائیں مُڑ دائیں بائیں
ساتھی سب اپنے کرلے اِکٹّھے
"آجاؤ مِل کر سب کھاؤ مِل کر
خطرہ جو سمجھو دُشمن جو دیکھو
پھر کیسا کھانا پھر کیسا گانا
ہوجاؤ ایسے غائب نظر سے
سمجھو، یہیں تھے لیکن نہیں تھے"

کیا کوئی سمجھے تیرے بہانے
کیا کوئی جانے تیرے ٹھکانے
ہُشیار تُجھ سا دیکھا نہ ہم نے
بے کار تُجھ سا دیکھا نہ ہم نے

فاروق حسن چانڈیو

اُستاد کوّے

Sharjeel Ahmed

میں ابّا جان کی نصیحتوں سے اِس طرح بھاگتا تھا جیسے کوّا غُلیل سے۔ وہ جیسے ہی مجھے پیار سے بُلاتے، میں بھانپ جاتا کہ آئی شامت۔ فوراً کوئی بہانہ بناکر بھاگ جاتا۔ میں اِس مصیبت سے بچنے کے لیے پہلے سے کئی بہانے سوچ لیتا لیکن اِس کے باوجود کبھی کبھی پکڑا جاتا۔ پھر تو وہ مارے نصیحتوں کے میرا ناک میں دم کردیتے۔ ایسے وقت "مرتا کیا نہ کرتا" کے مصداق اچانک ایسے اُچھلتا جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔ پھر دوڑتے ہوئے کہتا "مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔ ابھی آتا ہوں"۔ اور اِس سے پہلے کہ ابّاجان وہ ضروری کام معلوم کرتے، میں بھاگ چکا ہوتا تھا۔

جب سے ابّا جان کی طبیعت کچھ خراب رہنے لگی تھی، نصیحتوں کی تعداد کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ اُنہوں نے اپنی نصیحتوں کو مجھ پر لادنے کے لیے "جوڑ کا توڑ" بھی کرلیا تھا۔ آپ حیران ہوں گے کہ جوڑ کا توڑ کیا بلا ہے؟ لیجیے، میں آسان الفاظ میں بتائے دیتا ہوں۔ "جوڑ" کا مطلب ہے میرے بنائے ہوئے لاجواب بہانے، اور "توڑ" کا مطلب ہے اِن بہانوں کا توڑ۔

مثلاً ایک دن ابّا جان نے اپنے مخصوص شفیق لہجے میں مجھے بلایا تو میں نے فوراً کہا "ابّا جان، میرے سر میں درد ہے۔ حکیم جی کے پاس جارہا ہوں"۔

"بیٹے طبیعت تو میری بھی ٹھیک نہیں۔ دلاور کو بھیج کر حکیم جی کو یہیں بُلوا لیتے ہیں" ابّا جان نے مسکرا کر میرے بہانے کا توڑ کیا۔

میرے سر میں درد تو تھا ہی نہیں، اِس لیے بولا "کوئی بات نہیں، ابّا جان۔ کچھ زیادہ درد نہیں ہے۔ بعد میں دوا لے لوں گا" یہ کہہ کر مجبوراً اُن کی نصیحتوں کا زہر برداشت کرنے کے لیے اُن کے پاس جابیٹھا۔

ابّا جان گھما پھرا کر ایک ہی نصیحت کو میرے بھیجے میں بھرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اُنہوں نے کہا "شاہد بیٹے، تم چاروں بھائیوں میں بڑے ہو، اِس لیے تم پر ذمّے داری عائد ہوتی ہے کہ تم اپنے بھائیوں کو متّحد رکھو۔ اُن میں کوئی جھگڑا، کوئی نااتّفاقی پیدا نہ ہونے دو۔ اِسی میں تمہارا فائدہ ہے۔ چاروں بھائی مِل جُل کر رہو گے تو کسی کو تمہارے خلاف کچھ کرنے کی جُرأت نہ ہوگی۔ لیکن تم میں پھوٹ پڑگئی تو دُشمن تم کو کم زور جان کر طرح طرح سے ستائیں گے۔"

میں بظاہر تو اُن کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا، لیکن میرا دھیان کسی اور طرف تھا۔

ابّا جان میری سوچوں کو بھانپ گئے تھے۔ اُن کے چہرے پر بے اِطمینانی اور فکر جھلک رہی تھی۔ وہ کچھ دیر

مجھے گھورتے رہے' پھر بولے "شاہد بیٹے' لگتا ہے تم کو میری باتیں ایک بوڑھے کی بک بک لگ رہی ہیں۔ مگر بیٹے' یہ بک بک نہیں' حقیقت ہے۔ ایک اکیلا اور کمزور ہوتا ہے۔ اُس کی آنکھیں صرف سامنے کے خطروں کو دیکھ سکتی ہیں۔ تم چاروں بھائی اِتفاق سے رہو گے تو چاروں طرف کے خطروں کا مُقابلہ کرسکو گے"۔

اِس کے بعد اُنہوں نے وہی پُرانی مثالیں دیں کہ ایک لکڑی یا ایک دھاگا توڑنا آسان ہوتا ہے جب کہ چار دھاگے یا چار لکڑیاں ملاکے توڑنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہوجاتا ہے۔

ابّاجان اکثر بیمار رہنے لگے تھے۔ وہ گاؤں کے حکیم سے علاج کرا رہے تھے مگر صحّت روز بروز خراب ہوتی جارہی تھی۔ میں لاکھ بے پروا سہی' مگر اُن کی زندگی کا دُشمن نہ تھا۔ اُن کی بدولت مجھے ایک ڈھارس اور حوصلہ رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں سچّے دل سے اُن کی صحّت و تن دُرستی کے لِیے دعا کرتا تھا۔

ایک دن ابّاجان نے کہا "بیٹے شاہد' میری دوا بنانے کے لِیے حکیم صاحِب کو کوّے کے انڈوں کی ضرورت ہے۔ تم جنگل میں کوّے کا گھونسلا تلاش کرکے اُس میں سے انڈے لے آؤ"۔

میں کوئی بہانہ کِیے بغیر جنگل کی طرف چل پڑا۔ راستے میں شادی خان چرواہے سے مُڈبھیڑ ہوگئی۔ وہ اپنی بکریاں چُرا رہا تھا۔ مجھے مذاق سُوجھا۔ بولا "بتاؤ' شادی بدخبر۔ کب سُنا رہے ہو کوئی اچھی خبر؟"

اُس نے حیران ہوتے ہوئے کہا "ارے شاہد' یہ تمہارے مُنہ پر کالک کس نے مل دی ہے"؟

میں نے فوراً جیب میں سے آئینہ نکالا اور مُنہ دیکھا تو اُس پر کوئی کالک نہ تھی۔ میں شرمندہ ہوکر پھیکی ہنسی ہنسنے لگا۔ شادی خان میرے بے وقوف بن جانے پر خوب قہقہے لگا رہا تھا۔ ظاہر ہے اُس نے مذاق کا بدلہ لے لیا تھا۔

مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ شادی خان سے کوّے کے گھونسلے کے بارے میں معلوم کیا جائے۔ وہ سارا دن جنگل میں بکریاں چراتا تھا۔ اِس لِیے اُسے معلوم ہوگا کہ کوّے کا گھونسلا کس درخت پر ہے۔ میں نے کہا "بھائی شادی خان' کوّے کا گھونسلا کس درخت پر ہوگا؟ مجھے کوّے کے انڈوں کی ضرورت ہے"۔

"ہاہا! تم مجھے شادی بدخبر ہی بولو تو بہتر ہوگا۔ کیوں کہ تم کوّے کے انڈے لے کر صحیح سلامت واپس نہیں آسکتے"۔

"تمہارے مُنہ میں خاک! نہیں بتاتے تو نہ بتاؤ۔ بُری فال تو مُنہ سے نہ نکالو" میں نے کہا۔

"خاک چاٹ کر تو تم واپس آؤ گے۔ تب میں خوشی سے ناچوں گا" شادی خان بولا۔

"اچھا' اب مذاق چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ کوّے کا گھونسلا کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

اُس نے اُنگلی سے اِشارہ کرکے کہا "وہ دیکھو' وہ جو بڑا سا کیکر کا درخت ہے' اُس پر کوّے کا گھونسلا ہے۔ مگر میری مانو' وہاں کوّے ٹھونگیں مار مار کے تمہارا حُلیہ بگاڑ دیں گے"۔

میں نے جلدی سے کہا "بس' بس' اپنی نصیحتیں رہنے دو۔ اِس کام کے لِیے ابّاجان ہی کافی ہیں۔"

"تمہاری مرضی۔ جاؤ" شادی خان نے مُنہ بنا کر کہا۔

میں نے اُس کا مُنہ چِڑایا اور چل پڑا کیکر کے درخت کی طرف۔ درخت بہت اُونچا تھا اور گھونسلا اُس کی سب سے اُونچی شاخ پر تھا۔ مجھے درختوں پر چڑھنے کا کوئی خاص تجربہ نہ تھا' اِس لِیے سوچا کہ واپس شادی خان کے پاس جاؤں اور اُس سے کہوں کہ وہ اُوپر چڑھ کر انڈے اُتار دے۔ لیکن اِس خیال کو یہ سوچ کر رد کردیا کہ شادی خان میرا مذاق اُڑائے گا۔

میں نے آستینیں چڑھائیں اور اُوپر چڑھنا شروع کردیا۔ ابھی کچھ ہی اُوپر پہنچا تھا کہ کوّا کائیں کائیں کرکے چیخنے چلّانے لگا۔ لیکن میں نے اُس کے چیخنے چلّانے کی پروا نہ کی اور اُوپر چڑھتا گیا۔ اِس پر وہ کوّا کائیں کائیں کرتا ہوا

وہاں سے چلا گیا۔ میرے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ لیکن یہ مسکراہٹ پندرہ بیس سیکنڈ سے زیادہ نہ رہ سکی۔ اچانک کوّوں کا ایک غول اُڑتا ہوا آیا اور اُس نے مجھ پر حملہ کردیا۔ کوئی چونچ سے میرے سر پر ٹھونگا مار کر آگے نکل جاتا تو کوئی اپنے پنجوں سے میرے چہرے کو نوچنے کی کوشش کرتا۔ میں نے ایک ہاتھ سے تنے کو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ سے کوّوں سے خود کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

میرا خیال تھا کہ کوّے میرے ڈرانے دھمکانے سے بھاگ جائیں گے، لیکن وہ تو چٹان کی طرح ڈٹے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے ٹھونگیں اور پنجے مار مار کر میرا سر اور چہرہ لہولہان کردیا۔ میں چیخ چیخ کر مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ مگر کوئی مدد کو نہ آرہا تھا۔ میرے ہاتھ بُری طرح تھک گئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چند لمحوں میں نیچے گر جاؤں گا، جس سے یا تو میری گردن ٹوٹتی یا ہاتھ پاؤں ٹوٹتے۔

اچانک شادی خاں کی آواز آئی "شاہد! شاہد! گھبرانا نہیں۔ میں آتا ہوں۔" یہ سُن کر مجھے کچھ حوصلہ ہوا اور میں نے اپنی پوری قوّت کو کام میں لاکر تنے کو مضبوطی سے پکڑے رکھا۔ کوّے مسلسل حملے کیے جارہے تھے۔

"نیچے اُترنے کی کوشش کرو۔ میں غلیل سے کوّوں کو بھگانے کی کوشش کرتا ہوں" شادی خاں نے یہ کہہ کر کوّوں پر گُلّے برسانا شروع کردیے۔ میں آہستہ آہستہ نیچے کھسکنے گا۔ عام حالت میں تو میں ایک اِنچ بھی نیچے نہیں کھسک سکتا تھا۔ مگر اُس وقت میری جان پر بنی ہوئی تھی۔ میں نے ہمّت نہ ہاری، جُوں توُں کرکے نیچے اُترا اور نڈھال ہوکر گر پڑا۔

شادی خان نے چیخ کر کہا "بھاگو، شاہد، بھاگو! کوّے واپس آگئے ہیں۔" اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اُٹھایا۔ ہم دونوں سرپٹ بھاگنے لگے۔ لیکن کوّوں نے ہمارا پیچھا نہ چھوڑا۔ وہ برابر حملے کیے جارہے تھے۔ آخر اُن کے حملے رفتہ رفتہ ختم ہوگئے اور ہم ایک جگہ رُک کر لیٹ گئے۔ خوف اور تھکاوٹ کی وجہ سے میں ہوش وحواس کھو بیٹھا تھا۔

جب مجھے ہوش آیا تو شادی خان کو اپنے اُوپر جُھکا ہُوا پایا۔ وہ لوٹے سے میرے مُنہ میں بکری کا دودھ ڈال رہا تھا۔ وہ لوٹا، کُلہاڑی اور غلیل ہر وقت اپنے ساتھ رکھا کرتا تھا۔

مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر شادی خان نے کہا "شاہد بھائی، میں نے تم کو بتایا تھا کہ تم کوّے کے انڈے نہیں لاسکو گے۔ اِن پرندوں میں بہت ایکا ہوتا ہے۔ اِن کے کسی ساتھی پر کوئی مُصیبت آجائے تو یہ سب مِل کر اُس کا بچاؤ کرتے ہیں۔ افسوس! تم نے میری بات نہ مانی اور اِس حال کو پہنچے۔"

جب میں گھر پہنچا تو میرا بُرا حال دیکھ کر میرے بھائی پریشان ہوگئے، مگر ابّاجان کے چہرے پر پریشانی کی بجائے مسکراہٹ تھی۔ اُنھوں نے مسکراتے ہوئے کہا "شاہد بیٹے، انڈے لائے؟ ضرور لائے ہوگے۔ بھلا اِن حقیر اور کم زور کوّوں کی کیا مجال کہ میرے پہلوان بیٹے کو انڈے لینے سے روک سکیں"۔

ابّاجان کے اِن الفاظ میں میرے لیے بڑا سبق تھا۔ یہ اِتّفاق اور اِتّحاد کا سبق تھا۔ اُن کمزور اور حقیر کوّوں نے مجھے یہ بتادیا تھا کہ اگر کمزور مُتّحِد ہوجائیں تو بڑے سے بڑے طاقت ور کو شِکست دے سکتے ہیں۔

میں نے شرمندہ لہجے میں کہا "ابّاجان، کوّوں نے اپنے اِتّحاد کی قوّت سے مجھے شِکست دے دی۔ لیکن مجھے اپنی اِس شِکست سے اِتّفاق واِتّحاد کا وہ عظیم سبق مل گیا جو آپ کی نصیحتوں سے نہ مل سکا تھا"۔

"شکر الحمدُ لِلّٰہ! میرا منصوبہ کامیاب ہوگیا" ابّاجان نے کہا "شاہد بیٹے، جب میں نے دیکھا کہ تم پر میری نصیحت کا اثر نہیں ہوتا تو میں نے تمہیں عملی سبق سکھانے کے لیے کوّے کے انڈے لینے بھیج دیا۔ میرے بیٹے، مجھے تمہارا یہ حال دیکھ کر بہت دُکھ پہنچا ہے، مگر مجھے اِس بات کی بہت خوشی ہے کہ کوّوں نے تمہیں جو سبق دیا ہے، اُسے تم زندگی بھر یاد رکھو گے"۔

سید محمد جاوید

ہم نے بکرا خریدا

کاہل تو ہم ویسے ہی بہت ہیں۔ ہمارا بس چلے ہم ساری دُنیا کو بحرُالکاہل میں تبدیل کر دیں۔ سمندروں میں بحرالکاہل ہمیں اِس لِیے پسند ہے کہ اِس کے نام کے ساتھ کاہِل لگا ہوا ہے۔ اب دیکھیے ناں، کاہل ہے جب ہی تو سب سے بڑا ہے۔

ابّو جان کے پیر میں درد تھا، بھائی جان کو چھُٹی نہیں مل رہی تھی اور بقرعید سر پر آگئی تھی۔ اور بھلا بقرعید میں بکرا نہ آئے تو پھر بقرعید کاہے کی؟ امّاں نے ہمیں حکم دیا "اِس دفعہ بکرا تمہیں لانا ہے"۔

"آجائے گا" ہم نے فوراً جواب دیا اور بستر پر اوندھے مُنہ پڑ کر کہانیوں میں مگن ہوگئے۔

دن گزر گیا۔ رات بھی گزر گئی۔ دوسرا، تیسرا اور چوتھا دن بھی گزر گیا، اور چاند رات سر پر آگئی تو ہمیں مجبوراً بکرا لانے کے لِیے تیار ہونا پڑا۔

"بکرا دیکھ کر لینا۔ دو دانت کا ہو۔ سمجھے" ابّو جان نے ہمیں بتایا۔

"اور ہاں" امّاں نے کہا "کن کٹا نہ ہو۔ دونوں آنکھیں دیکھ لینا۔ تن دُرست ہو"۔

"بالکل ہڈی چمڑے کا ڈھانچا نہ اُٹھا لانا" بھائی جان نے کھانا کھاتے ہوئے بھی بولنا ضروری سمجھا۔

ہم نے نصیحتوں کی ٹوکری سر پر رکھی، رُوپے اِحتیاط سے جیب میں رکھے اور چل پڑے بکرا منڈی کی طرف۔ ابھی دروازے سے نکلے ہی تھے کہ شیطان صاحب مل گئے۔

"کیا ہو رہا ہے؟" اُنہوں نے ہمیں دیکھتے ہی زوردار نعرہ لگایا۔

"ہم جا رہے ہیں بکرا منڈی" ہم نے بتایا۔

"اِس سے پہلے آپ نے کبھی بکرا خریدا ہے؟" اُنہوں نے پوچھا۔

"نہیں، اکیلے نہیں خریدا۔ ابّو اور بھائی جان کے ساتھ ضرور خریدا ہے" ہم نے اُنہیں پوری بات بتائی۔

"میں آپ کو بکرے کی خریداری کروا دوں گا" شیطان نے پیش کش کی۔

"چلو" ہم نے اُن کی پیش کش قبول کرتے ہوئے کہا "ایک سے دو بھلے"۔

رکشے میں بیٹھ کر ہم لوگ اِرم سینما کے پاس بکرا منڈی پہنچے۔ پتا نہیں، شیطان نے رکشے کے میٹر کے

ساتھ کیا حرکت کی کہ میٹر نے گلشنِ اقبال سے اِرم سینما تک صرف تین روپے ساٹھ پیسے بنائے۔ جب ہم نے رکشہ والے کو پیسے دِیے تو اُس نے غصّے سے کہا "باؤ جی! یہ کیا دے رہے ہو؟"

"بھئی دُعائیں تو نہیں دے رہے" شیطان نے چہک کر کہا۔

"پر یہ تین روپے ساٹھ پیسے؟" اُس نے حیرت سے پوچھا۔

"میٹر دیکھ لو" ہم نے اُس سے کہا۔ اُس نے مڑ کر میٹر دیکھا، پھر ہمیں دیکھا اور پھر کہنے لگا "اجی قبلہ، میٹر خراب ہے"۔

"تو ہم کیا کریں؟" شیطان تیزی سے بولا۔

"اور پیسے دو" وہ اکڑنے لگا۔

شیطان نے بھی اکڑ دکھائی "کیوں دیں زیادہ پیسے؟ جتنے میٹر دکھائے گا، ہم اُتنے ہی دیں گے"۔

"دو گے کیسے نہیں" رکشے والے نے لپک کر شیطان کی کلائی پکڑلی۔ شیطان درد سے چیخ پڑا۔ اُس کی چیخ پکار سُن کر کئی لوگ جمع ہوگئے۔ بھیڑ دیکھ کر ایک پولیس والا آگیا۔

"تم لوگوں نے کیا مجمع لگا رکھا ہے؟ جلسہ کرتے ہو تم لوگ یا بکرا منڈی میں سیاست کر رہے ہو؟" پولیس کانسٹیبل نے گرج کر کہا۔

"الٰہی خیر!" ہمارے مُنہ سے نکلا۔ بڑی مُشکل سے لوگوں نے پولیس والے کو سمجھایا کہ بھائی کوئی جلسہ ولسہ نہیں کر رہے، رکشے والا پیسے زیادہ مانگ رہا ہے۔

"تو کیا ہُوا" پولیس والے کو ساری بات سُن کر مایُوسی ہوئی "دے دو"۔

"واہ! کیوں دے دیں؟" شیطان بولا "یہ قانون کی خِلاف ورزی ہے۔ تم قانون توڑتے ہو؟"

پولیس والے کو ہوش آگیا۔ اُس نے رکشے والے سے تین روپے ساٹھ پیسے چھینے اور چالان بُک نکال کر اُس کا چالان کرنے لگا۔

"چلو، بھاگ چلو" شیطان نے ہمارے کان میں سرگوشی کی "ورنہ ہمارا بھی چالان ہو جائے گا"۔

بکرا منڈی میں داخل ہُوئے تو جدھر نظر اُٹھائی، بکرے ہی بکرے نظر آئے۔

"مجھے تو یُوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں خود بکرا ہُوں" شیطان نے اِتنے سارے بکرے دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن ایک بات کا خیال رکھنا" ہم نے اُنہیں سمجھایا "ہمیں سینگ نہ مار دینا اور کسی بکرے سے دوستی کرنے نہ بیٹھ جانا"۔

"بکرا چاہیئے؟" ایک بکرے والے نے ہمیں روک کر پُوچھا۔

"نہیں۔ ہم تو ہاتھی خریدنے آئے ہیں، تمہارے پاس" ہم نے جواب دیا۔ پہلے تو بکرے والا ہمیں حیرت سے دیکھتا رہا۔ پھر ہنس پڑا "ہی ہی، ہی ہی۔ مذاق کر رہے ہو"۔

"کیوں؟ میں تمہارا کیا لگتا ہوں جو تم سے مذاق کروں گا؟" ہم نے کہا۔ اِس پر شیطان نے ہمیں ٹوکا اور بکرے والے سے بولا "کوئی اچھا بکرا دکھاؤ"۔

"ایک سے ایک اچّھا اور تن دُرست بکرا ہے، میرے پاس۔ ایمان سے، طبیعت خوش ہو جائے گی"۔ اُس نے ہمیں بکرے دکھانے شروع کیے۔

"نہیں، بھائی" ہم نے ایک بکرا دیکھ کر کہا "یہ تو کانا ہے"۔

"تو کیا ہُوا؟" شیطان بولا "بکرا تو ہے"۔

"مگر کانے بکرے کی قربانی جائز نہیں ہوتی"۔

اِس کے بعد ایک دوسرا بکرا دیکھا، بڑا تن دُرست اور صحت مند۔ ہم نے اُس کا مُنہ کھولا تاکہ دانت گِن سکیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" شیطان نے پُوچھا۔

ہم نے کہا "دانت گِن رہے ہیں"۔

"کیوں؟ کیا ٹوتھ پیسٹ کرانا ہے؟" شیطان نے پُوچھا۔

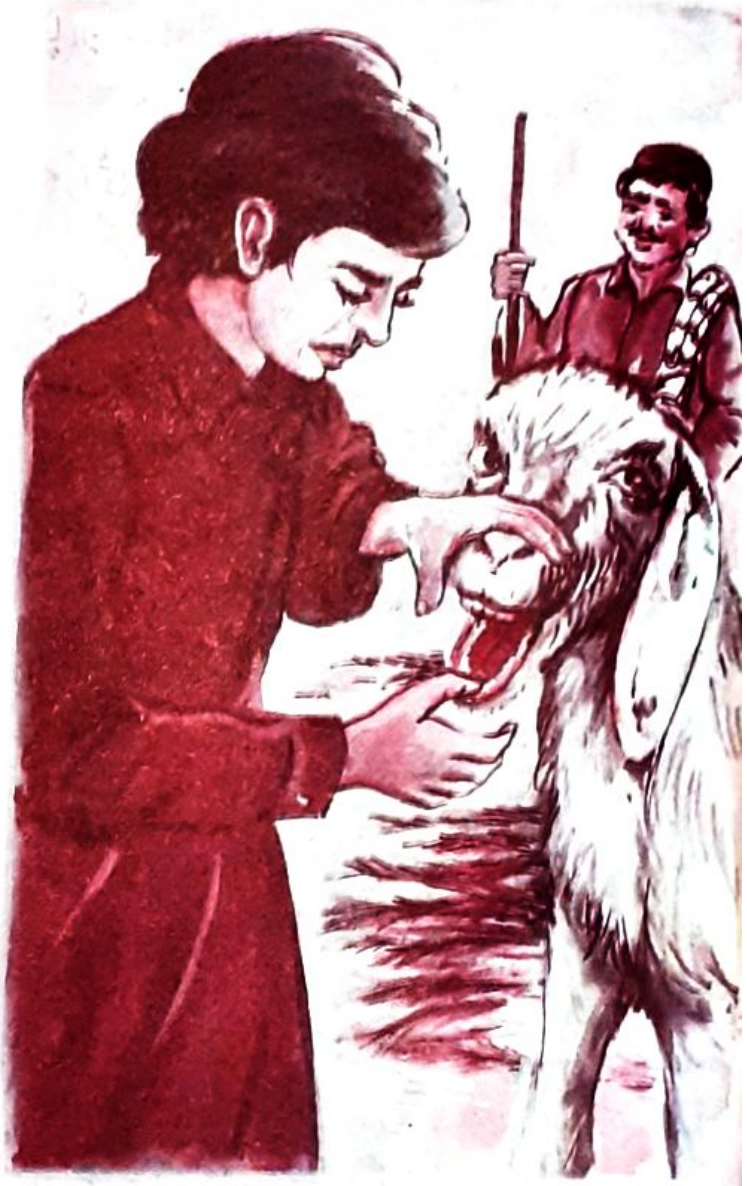

"تم چُپ رہو جی!" ہم نے اُسے ڈانٹا اور بکرے کا مُنہ کھولنے میں مصروف ہوگئے۔ مگر بکرا تھا کہ کسی طرح مُنہ ہی نہیں کھول رہا تھا۔

"لاؤ' میں کھولوں" شیطان نے کہا اور زور لگا کر دونوں ہاتھوں سے اُس کا مُنہ چیر دیا۔ پھر خود ہی اُس کے دانت گننے لگے۔ جیسے ہی شیطان کا ہاتھ ہٹا' بکرے نے جھٹ مُنہ بند کر لیا اور شیطان بکرے کے مُنہ میں ہاتھ دیے چیخنے لگے "ہائے میں مرا! ہائے میں مرا!"

بکرے والا ہنستے ہوئے بولا "واہ' باؤ جی، اب بکرا تمہارے دانت گِن رہا ہے"۔

بڑی مُشکلوں سے شیطان کا ہاتھ چھُڑایا گیا۔ وہ بکرے سے ذرا دُور کھڑے ہو کر اُسے یُوں گھُورنے لگے جیسے اُس کی ٹانگ چبا جائیں گے۔ مگر بکرے کو اُن کا گھورنا ایک آنکھ نہ بھایا۔ اُس نے اِتنی پھُرتی سے اُن کے پیٹ میں ٹکّر ماری کہ وہ زمین پر گر کر ہائے ہائے کرنے لگے۔ اب شیطان کی ضِد تھی کہ یہی بکرا خریدا جائے۔ میں بقرعید کے روز اِسی کی کلیجی کھاؤں گا۔

ہم ڈر گئے کہ کہیں وہ ہمارے ٹکّر نہ مار دے۔ ہم نے فوراً اُس کی قیمت پُوچھی۔

"پچّیس سو" بکرے والے نے کہا۔

"پچّیس سو!" ہم بے ہوش ہوتے ہوتے بچے۔

"25 سو!" شیطان یُوں چیخے جیسے اُن پر سو مرتبہ لاحول پڑھ دی گئی ہو "یہ تُم بکرا بیچ رہے ہو یا اُونٹ؟"

"باؤ جی' یہ پی آئی اے کے جہاز سے بھی اچّھا ہے" بکرے والا بولا۔

"وہ کیسے؟" ہم نے دِل چسپی سے پُوچھا

"کیا آپ بقرعید کے دن پی آئی اے کے جہاز کو ذَبح کر سکتے ہیں؟ اُس کی سیٹیں اور دروازے بھُون کر کھا سکتے ہیں؟ یا اُس کی کھڑکیوں کے سیخ کباب بنا سکتے ہیں؟ جب کہ بکرے کے ساتھ آپ ایسا کر سکتے ہیں" بکرے والا دانت نکال کر بولا۔

"ماشاء اللہ!" ہم نے بکرے والے کی ذِہانت کو داد دی "اِس بکرا منڈی میں کیسے کیسے افلاطون بکرے بیچنے آتے ہیں۔"

"اِس کے عِلاوہ اِس بکرے کا شجرۂ نسب شہنشاہ بابر سے ملتا ہے جو اِس کے پڑدادا کے پڑدادا کو افغانستان سے لایا تھا" بکرے والے نے بتانا شروع کیا مگر اِس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا' ہم نے بکرے کی قیمت پر بحث شروع کر دی اور کسی ماہر خریدار کی طرح اُس کی قیمت 25 سو سے دو ہزار تک لے آئے۔ بکرے والے نے رقم جیب میں ڈالی اور بکرے کی رسّی ہمارے ہاتھ میں تھما دی۔ ہم خوش خوش گھر آگئے۔

جلاتے چلو چراغ

Sharjeel Ahmed محمود مُراد، کھوکھراپار کراچی

تارو آپی کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور چُوں کہ یہ اِس گھر کی پہلی شادی تھی اور وہ بھی لڑکی کی، اِس لِیئے امّی کچھ گھبرائی، بوکھلائی سی رہتی تھیں۔ اگرچہ کوئی مالی پریشانی نہ تھی، پھر بھی شادی کی طرح طرح کی رسُومات اور سو طرح کے دوسرے جھنجٹ اُن کے ذہن پر سوار تھے۔

اُس روز میں شادی کارڈوں پر مہمانوں کے نام لکھ رہا تھا اور امّی بیٹھی کچھ سوچ رہی تھیں کہ اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے امّی سے کہا "رابعہ خالہ کا نام نہیں ہے فہرست میں"

امّی نے چونک کر مجھے دیکھا۔ پھر اُن کے ماتھے پر سلوٹیں پڑ گئیں اور رگیں تن گئیں۔ وہ بولیں "جو ضروری لوگ تھے، اُن سب کے نام لِکھ کر تمہیں دے دِیے ہیں۔ تم اُن کے نام لکھ دو، اور بس!"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے چلی گئیں۔ مجھے یاد آیا کہ کچھ عرصہ قبل امّی اور رابعہ خالہ کے درمیان کسی بات پر اَن بَن ہو گئی تھی۔ خیر، میں نے کاندھے اُچکائے اور مزید سوچنے کا اِرادہ ترک کر کے دوبارہ کارڈوں پر جُھک گیا۔

شام کو امّی، میں اور تارو آپی چائے پی رہے تھے کہ ننھّی سِدرہ دوڑتی ہوئی اندر آئی اور بولی "امّی، امّی، یہ گُناہ کیا ہوتا ہے؟"

سِدرہ میری چھوٹی بہن کا نام ہے۔ وہ بہت ذہین اور باتونی ہے۔ اِسی سال اُسے پہلی جماعت میں داخل کرایا گیا تھا۔ امّی نے دِھیرے سے مسکرا کر اُس کا گال تھپ تھپایا اور بولیں "بیٹا، اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسُول حضرت محمّد ﷺ کی نافرمانی کو گناہ کہتے ہیں۔"

"امّی، گناہ کرنے سے کیا ہوتا ہے؟" سِدرہ نے دُوسرا سوال کیا۔

"گُناہ کرنے سے اللہ ناراض ہوتا ہے اور گُناہ کرنے والے کو سزا دیتا ہے" امّی نے جواب دیا۔

یہ سُن کر سِدرہ کی آنکھیں خوف سے پھیلتی چلی گئیں۔ اُس نے کہا "اُوئی اللہ! اب کیا ہوگا؟" یہ کہہ کر وہ باہر بھاگ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ اپنی سہیلی حِرا کے ساتھ پھر اندر آئی اور بولی "امّی، پتا ہے، کل ہماری مِس بچّوں کو بتا رہی تھیں کہ جو بچّے ایک دوسرے سے ناراض ہو جاتے ہیں، اُنہیں گُناہ ہوتا ہے۔ مجھے پتا نہ تھا کہ گُناہ کیا ہوتا ہے۔ آپ نے بتایا تو میں نے سوچا کہ میں بھی تو حِرا سے ناراض ہُوں۔ اِس لِیئے مجھے بھی گُناہ ہو رہا ہوگا۔"

یہ کہہ کر اُس نے خوف سے جُھرجُھری لی اور اپنی ننھّی ننھّی ہتھیلیاں گول مٹول گالوں پر رکھتے ہوئے بولی "سچ مجھے بہت ڈر لگا۔ میں نے سوچا، میں اِتنی سی تو ہُوں۔ اگر مجھے اللہ میاں نے سزا دے دی تو کہیں میں چڑیا نہ بن جاؤں، جیسے وہ شہزادی بدرُ النِّساء بن گئی تھیں جب اُس نے بوڑھے مالی کو تنگ کیا تھا۔ بس، پھر تو میں فوراً گئی اور حِرا کو منالیا۔ امّی، اب تو مجھے گُناہ نہیں ہوگا ناں؟"

امّی نے اُسے سینے سے لگالیا اور بڑے پیار سے بولیں

"ہرگز نہیں۔"

سِدرہ حِرا کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے باہر چلی گئی تو میں نے امّی کی طرف دیکھا۔ وہ سر جُھکائے کچھ سوچ رہی تھیں۔ میں نے کہا "امّی' وہ کیا حدیث ہے؟ ہاں' یاد آیا۔ ہمارے پیارے نبی حضرت محمّد ﷺ نے فرمایا ہے کہ کسی مسلمان کے لِیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے تین دِن سے زیادہ ناراض رہے۔"

"ہُوں!" امّی نے کہا اور پھر سر جُھکا لیا۔

دوسرے دن مارکیٹ جاتے ہوئے امّی نے مجُھے ایک پرچی تھماتے ہوئے کہا "بیٹا' یہ کچھ نام رہ گئے تھے۔ اِنہیں بھی لِکھ دینا۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئیں۔ میں نے پرچی کھول کر دیکھی تو اُس پر چند دوسرے ناموں کے ساتھ رابعہ خالہ کا نام بھی لِکھا ہُوا تھا۔ میں بے اِختیار مُسکرانے لگا۔

(پہلا اِنعام : 50 روپے کی کتابیں)

چیٹنگ

جویریہ رشید' فیصل آباد

رات کے بارہ بج چکے تھے' لیکن فریحہ ابھی تک پڑھائی میں مشغول تھی' کیوں کہ کل اُس کا انگلش کا ٹسٹ تھا اور وہ چاہتی تھی کہ اِس دفعہ اُس کے غزالہ سے زیادہ نمبر آئیں۔ غزالہ اُس کی دوست تھی۔ اُس کا اور غزالہ کا ہمیشہ پڑھائی میں مُقابلہ رہتا تھا۔ جب اُس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں تو کتابوں کو بیگ میں رکھا اور سو گئی۔

صبح اُس کی امّی نے اُسے جگایا۔ وہ جلدی جلدی تیار ہوکر اِسکول چلی گئی۔ اِسکول پہنچی تو دیکھا کہ غزالہ کچھ گھبرائی ہوئی ہے۔ اُس نے غزالہ سے پُوچھا تو اُس نے کہا کہ ہم کل رات ایک شادی میں چلے گئے تھے' اِس وجہ سے تیاری نہیں ہوسکی۔ فریحہ نے اُسے تسلّی دی اور کہا "کوئی بات نہیں۔ تم سوچ سوچ کر ٹسٹ کرنا۔ تمہارا ٹسٹ اچھا ہو جائے گا۔"

اِتنے میں گھنٹی بجی۔ سب بچّے کلاسوں کی طرف دوڑے۔ پہلا پیریڈ اُردُو کا تھا۔ اُس کے بعد انگلش کا ٹسٹ تھا۔ آخر اُردُو کا پیریڈ ختم ہُوا اور انگلش کا پیریڈ شروع ہوگیا۔ مِس افشاں نے بلیک بورڈ پر ٹسٹ لکھا اور کام میں مشغول ہوگئیں۔

فریحہ کو سارا ٹسٹ آتا تھا۔ وہ اِطمینان سے لکھتی رہی۔ اچانک اُس کی نظر غزالہ پر پڑی۔ اُس نے دیکھا کہ وہ کچھ گھبرائی ہُوئی ہے۔ اِسی دوران میں اُس کی نظر غزالہ کے ڈیسک پر پڑی' جس میں انگلش کی کتاب کُھلی ہوئی رکھی تھی اور وہ اُس میں سے دیکھ دیکھ کر لکھ رہی تھی۔ فریحہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اُس کی اِتنی اچھّی دوست ایسی گِری ہُوئی حرکت کرسکتی ہے۔

پہلے تو وہ سوچتی رہی کہ مِس کو بتائے یا نہ بتائے۔ لیکن پھر اُس نے سوچا کہ اگر میں نے مِس کو نہ بتایا تو ہوسکتا ہے کہ غزالہ نقل کرنے کو اپنی عادت بنا لے۔ اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُس کی اِتنی اچھّی دوست کسی بُرے راستے پر چل پڑے۔

وہ فوراً مس کی ٹیبل کے پاس گئی اور کہا "مِس' وہ .....وہ... غزالہ نے اپنے ڈیسک میں کتاب چُھپا رکھی ہے۔"

مِس غزالہ کے پاس گئیں اور اُس سے کتاب لے کر بولیں "غزالہ' میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ اِتنی گِری ہُوئی حرکت کریں گی۔" غزالہ شرم سے پانی پانی ہوگئی۔ مس نے کہا "غزالہ یہ ٹسٹ آپ کل دیں گی۔" اِتنے میں پیریڈ ختم ہونے کی گھنٹی بجی۔ مِس نے سب سے کاپیاں لے لیں۔

جب مِس کلاس سے باہر نکلیں تو فریحہ نے غزالہ سے کہا "تم نے ایسا کیوں کیا"؟

"بات مت کرو مجُھ سے" غزالہ نے مُنہ پھیر کر کہا۔ "مجُھے تُم سے ایسی توقّع نہ تھی" یہ کہہ کر وہ دوسری سیٹ پر

محسوس کر رہے تھے کہ اُنھوں نے دوسری بار اپنی زندگی بنائی ہے۔ (تیسرا اِنعام : 40 روپے کی کتابیں)

اِتنا تضاد کیوں؟

صائمہ نادِر حسن، حیدر آباد

"ہیلو، سیما۔ کیا ہو رہا ہے؟" نیلی نے سیما کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ارے نیلی تم! بھئی، میں تعلیم و تربیت پڑھ رہی تھی۔ اور سُناؤ، کیسی ہو؟"

"فائن۔ ایک گڈ نیوز ہے" نیلی نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔

"بھلا کیا......؟" سیما نے پُوچھا۔

"بھئی، پچھلے دِنوں ہمارے اِسکول میں ایک اِسپیچ کامپیٹیشن ہُوا تھا۔ اُس میں میں نے فسٹ پرائز وِن کیا ہے"۔

"اچھّا، مُبارَک ہو" سیما نے خلوص سے دُعا دی "اور ہاں، موضوع کیا تھا تقریر کا؟"

"تُم ٹاپک کی بات کر رہی ہو ناں؟ قومی زبان اور اُس کی اہمیّت پر اِسپیچ کرنی تھی۔ رِیلی، سب نے میری اِسپیچ کو بہُت لائک کیا" نیلی نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ "یہ تو بڑی اچھّی بات ہے" سیما نے کہا۔

"اور ہاں" نیلی بولی "کل میری برتھ ڈے پارٹی ہے۔ میں نے اپنی بہُت سی دوستوں کو اِنوائٹ کیا ہے۔ تمھیں بھی میں اِنفارم کر رہی ہُوں کہ ضرور آنا"۔

"ٹھیک ہے۔ ضرور آؤں گی" سیما نے ہامی بھرلی۔

"او کے، گُڈ بائے" نیلی نے یہ کہ کر اپنا پرس اُٹھایا اور چُوئنگ گم چباتی ہوئی چلی گئی۔ سیما نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ وہی لڑکی جس نے قومی زبان کی تعریف اور اہمیّت میں زمین آسمان ایک کر کے کل ٹرافی جیتی تھی، آج کس طرح مُنہ ٹیڑھا کر کے اور اِترا اِترا کر انگریزی نُما اُردُو یا اردُو نُما انگریزی جھاڑ رہی تھی۔ آخر ہمارے قول اور عمل میں اِتنا تضاد کیوں ہے؟

(چوتھا اِنعام : 35 روپے کی کتابیں)

ایک وفادار طوطے کی سچّی کہانی

نادیہ رؤف، سیکرڈ ہارٹ اِسکول لاہور

لندن کی ایک عورت نے ایک طوطا پال رکھا تھا۔ وہ اُس سے بڑا پیار کرتی تھی اور اُس کے کھانے پینے کا خوب خیال رکھتی تھی۔ طوطا بھی اپنی مالِکہ سے بڑا گھُل مِل گیا تھا۔

ایک دفعہ ایک چور پنجرے سمیت طوطا چُرا کے لے گیا اور کسی اور جگہ جا کر بِلّے نامی ایک شخص کے ہاتھ اَونے پَونے داموں بیچ دیا۔ بِلّے بھی طوطے کی بڑی دیکھ بھال کرتا تھا مگر طوطا اپنی مالِکہ کی جُدائی میں بہُت اُداس رہتا تھا۔

اِدھر طوطے کی مالِکہ بھی اپنے طوطے کے غم میں نِڈھال ہوئی جاتی تھی۔ ایک دن اُسے معلوم ہُوا کہ اُس کا طوطا بِلّے کے پاس موجود ہے۔ اُس نے فوراً پولیس کو اِطّلاع کر دی۔ چُناں چہ بِلّے چوری کا طوطا خریدنے کے اِلزام میں گرفتار کر لیا گیا۔

مُقدّمہ عدالت میں پیش ہُوا۔ اصل مالِکہ، بِلّے اور طوطا عدالت میں حاضر کر دیے گئے۔ وفادار طوطا اپنی مالِکہ کو دیکھتے ہی خوشی سے سیٹیاں بجانے لگا۔ جج کے حکم پر جب پنجرے کا دروازہ کھولا گیا تو وہ اُڑ کر اپنی مالِکہ کے کندھے پر جا بیٹھا اور اُسے پیار کرنے لگا۔ عدالت نے طوطے کی مالِکہ اور بِلّے دونوں سے علیٰحدہ علیٰحدہ طوطے کا نام پُوچھا، پھر طوطے سے پُوچھا تو اُس نے اپنا وُہی نام بتایا جو اُس کی مالِکہ نے بتایا تھا۔

اِن سب باتوں سے یہ ثابت ہو گیا کہ طوطا واقعی اُس عورت کا تھا۔ چُناں چہ جج نے طوطا اُس کے حوالے کر دیا اور چوری کا طوطا خریدنے کے جُرم میں بِلّے کو ایک سال قید کی سزا سُنا دی۔

(پانچواں اِنعام : 30 روپے کی کتابیں)

Sharjeel Ahmed

ایک دِن مشہُور شاعِر صُوفی تبسّم تانگے میں کہیں جارہے تھے۔ اُنہیں بہُت جلدی تھی۔ بار بار کوچوان سے کہہ رہے تھے "جلدی چلاؤ۔ جلدی چلاؤ"۔

جب کوچوان تنگ آگیا تو گھوڑے کو ایک پٹرول پمپ پر لے گیا اور پٹرول پمپ والے سے کہا "اِس میں دو گیلن پٹرول ڈال دو۔ اِس بابا کو بہُت جلدی ہے۔"

(فِدا محمّد ہاشمی، گلن خیل میانوالی)

رشیدہ (صائمہ سے) : تمہاری سہیلی فریدہ میں ایسی کون سی بات ہے کہ تُم اُس کی اِتنی دیوانی ہو؟

صائمہ : وہ دانتوں سے ناخُن کاٹتی ہے۔

"رشیدہ : یہ تو کوئی خاص بات نہیں۔ بہُت سی لڑکیاں دانتوں سے ہاتھوں کے ناخُن کاٹتی ہیں۔

صائمہ : وہ دانتوں سے پیروں کے ناخن کاٹتی ہے۔ (محمّد علی، گُل نار کالونی راول پنڈی چھاؤنی)

ایک انیمی قبرستان میں جُھومتا جھامتا چلا جارہا تھا کہ ایک ٹوٹی ہوئی قبر میں گرگیا اور گرنے کے ساتھ ہی اُسے نیند آگئی۔

دوسرے دن صبح کو اُٹھا تو اپنے آپ کو قبرستان میں دیکھ کر تعجّب سے بولا "غضب خدا کا! قیامت آگئی اور صرف میں ہی زندہ ہوکر قبر میں سے نکلا ہوں۔ باقی سب بے خبر سو رہے ہیں!" (نُعمان سلیم، اِقبال ٹاؤن لاہور)

ایک کنجوس شخص بازار سے گُزر رہا تھا۔ اُس کی ایک آنکھ کُھلی ہوئی تھی، اور دوسری بند تھی۔

ایک شخص نے اُس سے پُوچھا "بھائی صاحِب، آپ نے دوسری آنکھ کیوں بند کر رکھی ہے؟" کنجوس بولا "جب ایک آنکھ سے صاف نظر آرہا ہے تو دوسری آنکھ اِستعمال کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" (شازیہ بتُول، کالا گوجراں)

ایک چینی پاکستان آیا۔ ایئر پورٹ پر پاکستانی افسر نے اُس کا نام پُوچھا تو اُس نے اپنا نام "چِھینک" بتایا۔

افسر نے حیران ہوکر کہا "کیا یہ کوئی چینی نام ہے؟"

چینی بولا "جی نہیں۔ یہ میرے نام کا اُردُو ترجمہ ہے۔"

"پھر چینی زبان میں آپ کا نام کیا ہے؟" افسر نے پوچھا۔

"آچھو ----" چینی نے جواب دیا۔ (عرشیہ انجم، لاہور)

سپاہی (خاتون سے) : خاتون، جِس کار نے آپ کے ٹکّر ماری تھی، آپ نے اُس کا نمبر تو دیکھا ہوگا؟

خاتون (سوچتے ہوئے) : نہیں، میں نے اُس کا نمبر نہیں دیکھا۔ البتّہ اُس کار میں ایک اِسمارٹ سی عورت بیٹھی تھی۔ اُس نے گُلابی رنگ کا سُوٹ پہنا ہُوا تھا، جس کا کپڑا ساٹھ روپے میٹر والا تھا۔ اُس کے دائیں ہاتھ میں انگوٹھی تھی، جس میں نقلی ہیرا لگا ہُوا تھا، اور بالوں میں پیتل کا کِلپ تھا، جس پر سونے کا مُلمّع کیا ہُوا تھا"۔

(فریحہ دانِش، اِسلام آباد)

ایک امیر آدمی نے اپنے لِیے مقبرہ بنوایا۔ جب وہ تیّار ہوگیا تو اُس نے راج سے پُوچھا "اب اِس میں کس چیز کی کمی ہے؟"

"جناب، آپ کی" راج نے جواب دیا۔

(سیّد محمّد عاصِم فاطمی، کراچی)

پپّو کھلونے والا

ضیغم حمیدی

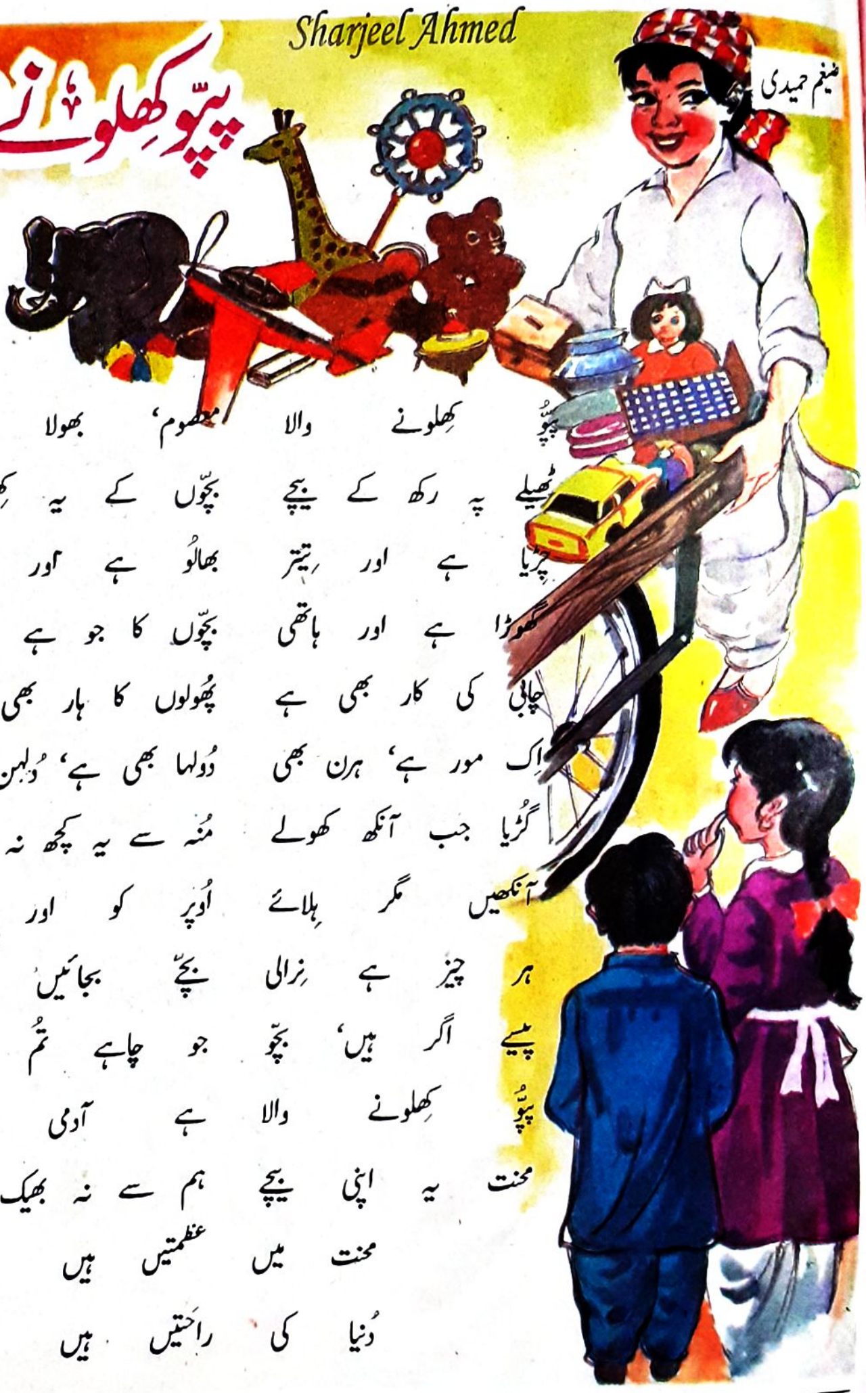

پپّو کھلونے والا معصوم، بھولا بھالا
ٹھیلے پہ رکھ کے بیچے بچّوں کے یہ کھلونے
چڑیا ہے اور تیتر بھالُو ہے اور بندر
گھوڑا ہے اور ہاتھی بچّوں کا جو ہے ساتھی
چابی کی کار بھی ہے پھُولوں کا ہار بھی ہے
اِک مور ہے، ہرن بھی دُولہا بھی ہے، دُلہن بھی
گڑیا جب آنکھ کھولے مُنہ سے یہ کچھ نہ بولے
آنکھیں مگر ہِلائے اُوپر کو اور نیچے
ہر چیز ہے نرالی بچّے بجائیں تالی
پیسے اگر ہیں، بچّو جو چاہے تُم خریدو
پپّو کھلونے والا ہے آدمی نرالا
محنت یہ اپنی بیچے ہم سے نہ بھیک مانگے
محنت میں عظمتیں ہیں
دُنیا کی راحتیں ہیں

چینی لوک کہانی

Sharjeel Ahmed

چالاک لومڑی بے وقوف شیر

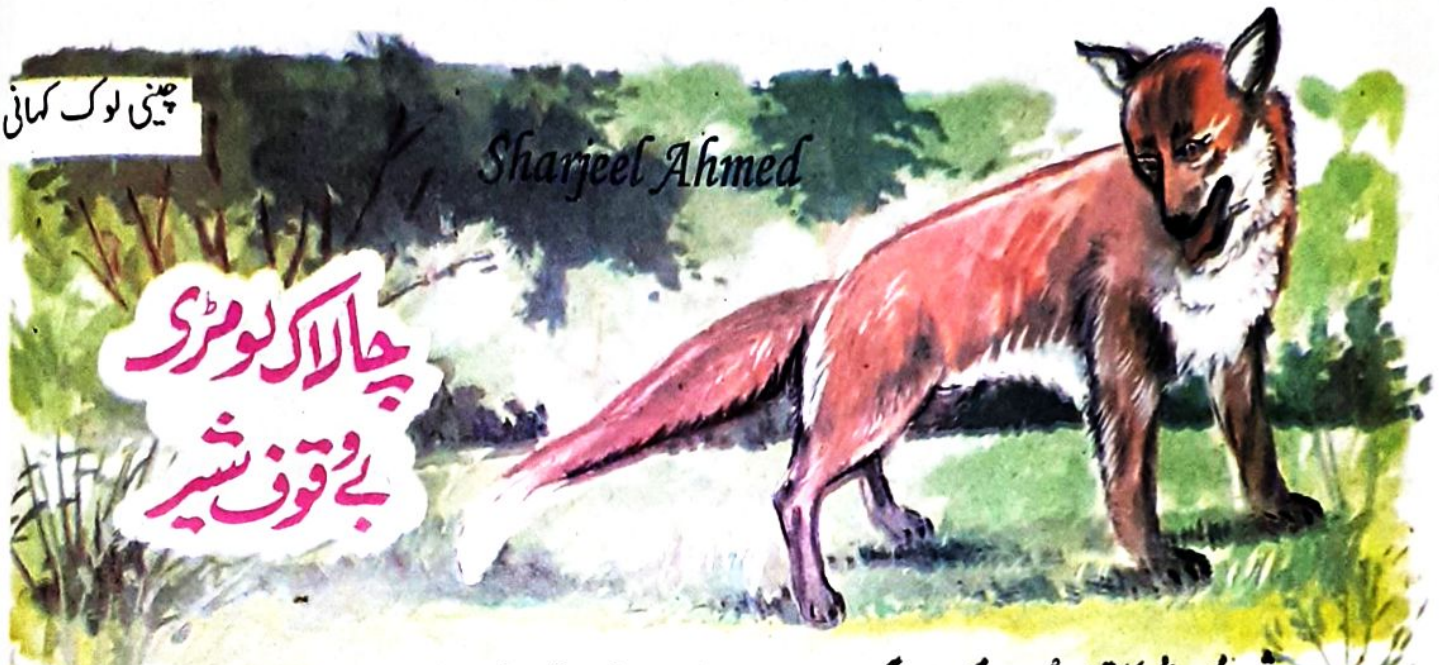

شیر بہت بھوکا تھا۔ اُسے جنگل میں گھومتے ہوئے کافی دیر ہوگئی تھی، لیکن کوئی بڑا شکار نہیں ملا تھا۔ اچانک ایک لومڑی دِکھائی دی۔ اُس نے چھلانگ لگائی اور لومڑی کو دبوچ لیا۔

لومڑی بولی "ٹھہرو! تم مجھے نہیں کھا سکتے۔ میں آسمانوں کے بادشاہ کی سفیر ہوں۔ اگر تم نے میرا بال بھی بیکا کیا تو تم پر آسمانوں کے بادشاہ کا قہر نازِل ہوگا!"

شیر نے کہا "مجھے یہ کیسے معلوم ہو کہ تم جو کچھ کہتی ہو، وہ سچ ہے؟ تمہارے پاس اِس کا کوئی ثبوت ہے؟"

"میرے پاس اِس کا ثبوت ہے" لومڑی اکڑ کر بولی "میرے ساتھ چلو اور راستے میں جو جانور ملے، اُس سے میرے بارے میں پُوچھو۔ سب یہی کہیں گے کہ میں آسمانوں کے بادشاہ کی سفیر ہوں"۔

دونوں پگ ڈنڈی پر چلنے لگے۔ آگے آگے لومڑی، پیچھے پیچھے شیر۔ جنگل کا جو جانور بھی شیر کو دیکھتا، سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جاتا۔

کچھ دُور چلنے کے بعد لومڑی رُک گئی اور گردن اکڑا کر بولی "دیکھا؟ سب جانور مُجھ سے ڈرتے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ اب تو تمہیں یقین آگیا ہوگا کہ میں آسمانوں کے بادشاہ کی سفیر ہوں۔"

شیر نے سر جُھکایا اور چُپ چاپ ایک طرف کو چلا گیا۔

ہمارا سرکس جس کا نام "لکی لائن سرکس" تھا، اِمام ی کے میلے میں تین دن اپنا شو پیش کر چکا تو سرکس کے لک چودھری اکرم نے فیصلہ کیا کہ اب سرکس کا کوئی شو یں ہوگا اور اگلا شو ایک دن چھوڑ کر وزیر آباد میں ہوگا۔ زیر آباد کا شہر پنجاب میں دریائے چناب کے بائیں کنارے جرنیلی سڑک پر واقع ہے۔

اِمام بری کا میلا تین دن لگتا ہے، اور اِن تین دنوں میں ہم نے دن رات کام کر کے لاکھوں روپے کمائے تھے۔ میں سرکس کا مینیجر تھا، اور مجھے معلوم تھا کہ چودھری ہمارے کام سے بہت خوش ہے۔ اُس نے کچھ فن کاروں کو اِنعام سے بھی نوازا تھا جِن میں میں بھی شامل تھا۔

لکی لائن سرکس میں دس سفید گھوڑے، دو جرمن کُتّے، تین انگورا بھیڑیں، ایک ہاتھی، چار ببر شیر اور ایک شیر تھا۔ اِن تمام جانوروں کی دیکھ بھال میرے ذِمّے تھی۔

ہم سرکس کا ساز و سامان اور جانور ٹرکوں میں لاد رہے تھے کہ چودھری اکرم میرے پاس آیا اور بولا "میں اور اشرف کار سے جائیں گے۔ کار ڈرائیور چلائے گا"۔

"یس، سر" میں نے کہا۔

اشرف چودھری کا بیٹا تھا جس کی عمر دس سال تھی اور جو اِمام بری کا میلا دیکھنے اِسلام آباد کے قریب سیدپور آیا تھا۔ وہ چھٹی جماعت کا طالبِ علم تھا۔

"اگر آپ کو کچھ اور رقم چاہیۓ تو مجھ سے لے لیں" چودھری نے کہا۔

"نو، سر۔ تھینک یُو، سر" میں نے کہا۔

"جانور سب ٹھیک ہیں ناں؟" چودھری نے پوچھا۔

"سر، شیر کچھ چڑچڑا ہوگیا ہے۔ البتّہ ببر شیر ٹھیک ہیں" میں نے کہا۔

"آپ کے خیال میں اُس کے چڑچڑے پَن کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟" چودھری نے پوچھا۔

"میرے خیال میں، اُسے تماشائیوں نے تنگ کیا ہے۔ یا ہو سکتا ہے جو گوشت اُسے پیش کیا گیا، وہ اُسے پسند نہ آیا ہو" میں نے بتایا۔

"اِس شیر سے کوئی خطرہ تو نہیں ہے؟ میرا مطلب ہے، وہ کسی جانور پر حملہ تو نہیں کرے گا؟" چودھری نے پوچھا۔

"اُسے دوسرے شیروں سے الگ رکھا جائے گا۔ جب

وہ اکیلا ہو گا تو کوئی خطرہ نہیں ہو گا" میں نے کہا۔

"سفر میں اُس کا خیال رکھنا ہو گا۔ بہت قیمتی جانور ہے" چودھری بولا۔

"یس' سر۔ بہت قیمتی جانور ہے۔ لیکن ابھی کم عمر ہے۔ پوری طرح جوان نہیں ہوا" میں نے بتایا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں' مینجر صاحب" چودھری نے کہا۔

چودھری اکرم نے فقرہ مکمل کیا ہی تھا کہ ہمارے پیچھے ٹرکوں میں بھگدڑ مچی اور خوف ناک شور اُٹھا۔ اِس بھگدڑ اور شور میں شیر کے دھاڑنے کی آواز آئی اور چودھری کے مُنہ سے بے اختیار "اللہ خیر کرے!" نکلا۔

ہم دونوں بھاگ کر ٹرکوں کی طرف گئے۔ وہاں سرکس کا عملہ ایک لاش کے گرد کھڑا تھا' جو خون میں لت پت تھی۔ یہ لاش چودھری کے بیٹے اشرف کی تھی۔ اُس نے لاش کو دیکھا تو دھاڑیں مارتا ہوا اُس پر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

میں نے باپ بیٹے کو کار میں ڈالا اور ہسپتال لے گیا۔ چودھری تو تھوڑی دیر بعد ہوش میں آگیا لیکن اشرف ہلاک ہو گیا تھا۔

ہُوا یُوں کہ سرکس کا عملہ شیر کو ایک پنجرے سے نکال کر دوسرے پنجرے کی طرف لے جا رہا تھا کہ اشرف آگیا اور اُس نے ٹرینر (شیروں کو تربیت دینے والا) کی چھڑی اُٹھا کر اُسی طرح شیر کو ڈرانے کی کوشش کی جس طرح ٹرینر اُسے ڈرایا کرتا تھا۔ شیر پنجرے سے باہر تھا اور چڑچڑا تھا۔ اُس نے اشرف پر حملہ کر دیا اور پنجہ مار کر اُس کا پیٹ پھاڑ دیا۔

سرکس کا عملہ شیر کے قریب نہ گیا۔ ہر کسی کو جان پیاری ہوتی ہے۔ جب شیر نے شور اور ہنگامہ سُنا تو جھاڑیوں میں سے ہو کر جنگل کی طرف نکل گیا۔ یہ جنگل اِسلام آباد اور مری کے درمیان ہے۔

ہم ابھی ہسپتال ہی میں تھے کہ چودھری نے مجھ سے کہا "میرا ایک ہی بیٹا تھا' جسے اُس مُوذی جانور نے مار ڈالا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اُس کو زندہ یا مُردہ پکڑ کر میرے پاس لائیں"۔

"سر' یہ میرے بس کی بات نہیں" میں نے کہا۔

"کیوں نہیں؟ کسی زمانے میں تم شیر کے شکاری تھے" چودھری نے کہا۔

"میں کبھی شیر کا شکاری نہیں رہا۔ میں ہرن' ہڑیال' پاڑہ اور نیل گائے شکار کیا کرتا تھا" میں نے کہا۔

"لیکن تم نے تو مجھے بتایا تھا کہ تم شیر کے شکاری ہو" چودھری بولا۔

"سر' میں نے جھوٹ بولا تھا' تاکہ آپ مجھے مُلازم رکھ لیں۔ میں اُن دِنوں بیکار تھا" میں نے سچ سچ بتایا۔

"لیکن تم نے تو مجھے انگلینڈ کے مشہور شکاری مسٹر گارفیلڈ کا سرٹی فی کیٹ دکھایا تھا کہ تم شیر کے شکاری ہو" چودھری نے کسی وکیل کی طرح جِرح کی۔

"گار فیلڈ صاحب ایک بار شکار کے دوران میں مچان سے گر کر زخمی ہو گئے تھے۔ اُس وقت میں اُن کے ساتھ تھا اور میں نے اُن کو ہسپتال پہنچایا تھا۔ اُنہوں نے خوش ہو کر مجھے سرٹی فی کیٹ دیا تھا۔ لیکن وہ دراصل جھوٹا تھا" میں نے کہا۔

"لیکن تم نے مجھے وہ جھوٹا سرٹی فی کیٹ کیوں دکھایا؟" چودھری نے غصّے سے کہا۔

"سر' میں نے بتایا ناں کہ مجھے اُس وقت نوکری کی بے حد ضرورت تھی" میں نے کہا۔

چودھری نے غصّے پر قابو پا کر کہا "خیر' کوئی بات نہیں۔ تم نے میرے سرکس میں بہت محنت اور ایمان داری سے کام کیا ہے۔ میں تم سے خوش ہوں۔ اب تم میرا آخری کام کرو۔ میرے بیٹے کے قاتل کو پکڑ کر لاؤ' زندہ یا مُردہ۔ اِس کام کے لیے میں تمہیں مُنہ مانگے دام دوں گا۔ اور ہاں' اِس کے بعد تم چاہو تو سرکس کی نوکری چھوڑ سکتے ہو"۔ یہ کہہ کر چودھری اکرم نے نوٹوں کا تھیلا میرے قدموں میں رکھ دیا۔

"اِس تھیلے میں پچاس ہزار روپے ہیں۔ اگر یہ رقم کم

ہو تو میں پچاس ہزار اور دُوں گا۔ لیکن کام ہونا چاہیئے" چودھری اکرم نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

"سرکس کا سامان اور عملہ وزیر آباد پہنچ جائے تو پھر میں یہ کام کروں گا"۔ میں نے کہا۔

"نہیں۔ ابھی روانہ ہو جاؤ۔ اِس وقت میں اپنے بچّے کی لاش خود لے کر جاؤں گا اور اپنے گاؤں میں دفن کروں گا۔ تم سرکس کے جانوروں اور کارکنوں کو اپنے اسسٹنٹ مینجر کے حوالے کرو اور شیر کی تلاش میں نکل جاؤ"۔

میں نے تھیلا اُٹھایا اور راول پنڈی کے قریب ایک بستی' ڈھوک رتّہ' میں آگیا۔ یہاں ایک شکاری' مِلک صِدّیق' رہتا تھا' جو پاکستان کے عِلاوہ بھارت' بنگلہ دیش' نیپال' بھوٹان اور سِکّم کے عِلاقوں میں بھی شکار کھیلتا رہا تھا۔ جب انگریز شکاری گارفیلڈ آسام کے جنگلوں میں شیر کا شکار کھیلنے کے لِئے گیا تو اُس وقت صِدّیق اُس کے ساتھ تھا۔ میری اور اُس کی ملاقات پہلی بار آسام میں ہوئی تھی۔ آسام بھارت کا ایک صُوبہ ہے۔

میری خوش قسمتی تھی کہ مِلک صِدّیق مجھے گھر پر ہی مل گیا۔ وہ اپنے گھر کے صحن میں' امرود کے درخت کے نیچے بیٹھا ڈاڑھی اور مونچھوں کو خضاب لگا رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو ہڑبڑا کر چارپائی سے اُٹھا اور مجھے گلے لگا لیا۔

"میرے شیرا آج عید کا چاند کدھر سے نکل آیا؟" ملک صدّیق نے مجھے بھینچتے ہوئے کہا "میرے شیر" اُس کا تکیہ کلام تھا۔

"کام تھا آپ سے' اِس لِیے آیا ہوں" میں نے کہا۔

"ہاں' میرے شیر۔ وہ تو میں جانتا ہوں۔ تم سرکس والے لوگ کام ہو تو ملتے ہو۔ کام نہ ہو تو پھر تُو کون اور میں کون"۔

وہ ہنسا تو اُس کے دانت اُس کے موٹے موٹے لبوں کے اندر چمکنے لگے۔ اُس کی عُمر 45 سال کے لگ بھگ تھی۔ قد چھ فٹ تھا۔ ہاتھ بڑے بڑے تھے۔ آنکھیں موٹی اور چمکیلی تھیں۔

"آپ تو جانتے ہیں کہ سرکس کی نوکری میں چُھٹی نہیں ملتی۔ آج یہاں' کل وہاں۔ صبح کہیں' شام کہیں۔ ہم لوگ ہر وقت سفر میں رہتے ہیں"۔ میں نے کہا۔

"کچھ بھی ہو' سرکس کی نوکری بہت دل چسپ نوکری ہے' میرے شیر"۔ مِلک صِدّیق نے کہا۔

"آج بھی میں اِسی سلسلے میں آیا ہوں۔ سرکس کے ایک شیر نے سرکس کے مالک کے بیٹے کو مار ڈالا ہے" میں نے بتایا۔

"تم نے شیر کو مار دیا ہوتا" وہ جلدی سے بولا۔

"وہ بھاگ گیا ہے" میں نے کہا۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا۔ وہ اب کسی اور کو مار دے گا"۔ ملک صدّیق بولا۔

میں نے اُسے تفصیل سے سارا ماجرا سُنایا، جو اُس نے پوری توجہ سے سُنا اور پھر میرے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوگیا۔

میں نے ایک جیپ کرائے پر لی اور علاقے بھر کے تھانوں اور محکمہ جنگلات کے چھوٹے بڑے دفتروں کو اطلاع دی کہ سرکس کا ایک شیر ایک آدمی کو جان سے مار کر جنگل کی طرف بھاگ گیا ہے۔ پولیس اور محکمہ جنگلات نے لوگوں کو خبردار کر دیا، خاص طور پر کسانوں، چرواہوں، لکڑہاروں اور گھسیاروں کو۔ اِس کے بعد ہم اُس طرف چل دیے جدھر شیر گیا تھا۔ یہ اسلام آباد کا شمالی جنگل تھا۔ ہم سارا دن جنگل میں گھومتے رہے لیکن شیر کا کوئی نشان نہ ملا۔ آخر شام کو ہم واپس ڈھوک رتہ، ملک صدّیق کے گھر، آگئے۔

ملک صدّیق کنوارا تھا۔ اُس نے مرغی کا گوشت خود پکایا اور پڑوسن سے روٹیاں پکوائیں۔ کھانا کھانے کے بعد ہم اُس کے گھر کی چھت پر چارپائیاں بچھا کر لیٹ گئے۔

صبح اُٹھ کر ہم نے جنگل کی راہ لی۔ ڈرائیور ہمیں جنگل میں چھوڑ کر چلا گیا۔

ہم سارا دن گھومتے رہے۔ شام ہوئی تو ایک چرواہے نے بتایا کہ کسی شیر نے اُس کی بھیڑ مار ڈالی ہے اور وہ اُسے اُٹھا کر لے گیا ہے۔ جب چرواہوں اور کسانوں نے شور کیا اور ایک کسان نے چھرّے دار بندوق سے فائر کیا تو شیر مُردہ بھیڑ کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔

ملک صدّیق نے چرواہے کی بات سُن کر کہا "شیر جنگل میں ہے۔ وہ اُس بھیڑ کو ضرور کھانے آئے گا جسے اُس نے شکار کیا ہے"۔

صدّیق کے کہنے کے مطابق ہم نے ایک چرواہے سے بکری خریدی اور اُسے لے کر، شام کو، جنگل کے اندر چلے گئے۔ بکری کو شیشم کے درخت کے نیچے باندھا اور خود شیشم کے اُوپر مچان بنا کر بیٹھ گئے تاکہ جب شیر بھیڑ کو کھانے آئے تو اُسے گولی مار کر ہلاک کر دیا جائے۔ اُسے زندہ پکڑنا ہمارے بس میں نہ تھا۔

جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ شروع شروع میں گیدڑوں اور بھیڑیوں کی آوازیں آئیں۔ اِس کے بعد وہ بھی خاموش ہوگئے۔ اُن کا ساتھ ایک اُلّو نے دیا تھا۔ لیکن اب وہ بھی خاموش تھا۔ بکری بھی دو ایک بار ممیائی تھی، پھر اُس نے بھی چُپ سادھ لی تھی۔ گویا جنگل میں ہر طرف چُپ کا راج تھا۔

ہم ساری رات مچان پر بیٹھے شیر کا اِنتظار کرتے رہے، لیکن شیر نہ آیا۔ نیند سے آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ لیکن ہم نے اپنے آپ کو بیدار رکھا، یہاں تک کہ صبح ہوگئی اور پرندوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔

میں نے سوچا، تھوڑی دیر میں جیپ ڈرائیور ہمیں لینے کے لیے گاؤں میں آئے گا اور پھر چوکیدار کو ساتھ لے کر ہماری تلاش میں نکلے گا۔ کیوں کہ اُس سے ہم نے یہی کہا تھا۔

ایک گھنٹے بعد چاروں طرف روشنی پھیل گئی اور پرندے کیڑے مکوڑوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر اُڑنے اور پھدکنے لگے۔ اور پھر جیپ کے ہارن کی آواز سُنائی دی جو زیادہ دُور نہ تھی۔

"اب کیا اِرادہ ہے؟" میں نے ملک صدّیق سے پوچھا۔

"اب چلتے ہیں۔ یہاں ٹھہرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ گارنیلڈ نے کہا تھا کہ شیر دن کو شکار نہیں کرتے' رات کو کرتے ہیں"۔

یہ کہہ کر ملک صدّیق نے اپنی بندوق پکڑی اور نیچے اُترنے لگا۔ میں اُس کے بعد اُترا۔ میں نے بکری کو درخت سے کھولا اور اُس کی رسّی پکڑ کر ملک صدّیق کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ ہمارا رُخ اُس طرف تھا جس طرف سے جیپ کے ہارن کی آواز آئی تھی۔

کچھ دور جاکر ملک صدّیق کھڑا ہوگیا اور اپنی بندوق مجھے دے کر بولا "میرے پیٹ میں کچھ گڑبڑ ہے۔ تم یہیں ٹھہرو۔ میں ابھی آتا ہوں"۔ یہ کہہ کر وہ گھنی جھاڑیوں میں غائب ہوگیا۔ اب بکری کی رسّی میرے بائیں ہاتھ میں تھی اور بندوق دائیں ہاتھ میں' اور میں خاموش کھڑا تھا۔

اور پھر اچانک وہ ہُوا جس کا مجھے سان گمان تک نہ تھا۔ شیر نے بکری پر حملہ کر دیا' اُسے چیرا پھاڑا' اُس کا خون پیا اور پھر اُس کا گوشت کھانے لگا!

مجھے سکتہ ہوگیا تھا اور ملک صدّیق خدا جانے کہاں مرگیا تھا۔ شیر بکری کا گوشت کھا رہا تھا اور غُرّا رہا تھا۔ میں اُسے دِیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی اپنی تیز چمکیلی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے گلے میں زنجیر تھی' وہی زنجیر جو سرکس میں اُس کے گلے میں ڈالی جاتی تھی۔

اُس نے جی بھر کر گوشت کھایا' میری طرف اِطمینان سے دیکھا' پنجوں سے مُونچھیں صاف کیں اور پھر دُم ہلانے لگا۔ اُس نے مجھے پہچان لیا تھا! میں نے اُس کی زنجیر پکڑی اور چل پڑا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے پالتُو کتّے کی طرح چل رہا تھا۔

اب یہ بتانے کی شاید ضرورت نہیں کہ ہم جیپ تک کیسے پہنچے۔ ہاں' میں یہ بتانے میں فخر محسوس کرتا ہوں کہ بھگوڑا شیر اب بھی لکی لائن سرکس میں ہے۔ اُس نے میری جان بچائی تھی۔ میں نے چودھری اکرم کے پیر پکڑ کر اُس کی جان بچالی تھی۔

چیکو سلواکیہ کی لوک کہانی

ملاّح اور مکھّی

ایک ملاّح سمندر میں ڈوب رہا تھا۔ تیرتے تیرتے آدھا دن گزر گیا تھا' کنارہ نظر نہ آرہا تھا۔ طاقت جواب دے گئی تھی۔ زندگی سے مایُوس ہوگیا تھا۔ قریب تھا کہ ہِمّت ہار کر' اپنے آپ کو موجوں کے حوالے کردے کہ ایک مکھّی دِکھائی دی جو' اُسی کی طرح' سمندر میں ڈوب رہی تھی۔

وہ اُس کی طرف دیکھ کر افسُردگی سے مسکرایا اور بولا "میں ایک آدمی اور تُم ایک مکھّی ---- ہم دونوں کا انجام ایک جیسا ہو گا۔"

دونوں سمندر کی بپھری ہوئی موجوں سے لڑتے رہے۔ پھر ملاّح نے سوچا "میرے بچنے کی تو کوئی اُمّید نہیں۔ آج نہیں تو کل مرجاؤں گا۔ اِس بے چاری مکھّی کو مرنا نہیں چاہیئے۔" اُس نے مکھّی کو اپنے سر پر بٹھالیا۔ چند لمحوں بعد' سورج کی گرم شُعاعوں نے مکھّی کے بھیگے ہوئے پروں کو خشک کردیا اور وہ اُڑ گئی۔

مکھّی تھوڑی دُور گئی تھی کہ اُسے ایک مچھیرے کی کشتی دکھائی دی۔ سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اِس لِیے ملاّح کو کشتی نظر نہ آئی تھی۔ مچھیرا بھی اُسے نہ دیکھ سکا تھا۔ مکھّی اُڑتی ہوئی کشتی کے پاس گئی اور مچھیرے کے کان پر بھِن بھِنانے لگی' جیسے کہہ رہی ہو "مدد! مدد! کوئی ڈوب رہا ہے! بچاؤ! بچاؤ!"

مچھیرے نے ہاتھ ہلا کر مکھّی کو بھگانا چاہا' مگر اُس نے پیچھا نہ چھوڑا۔ بار بار اُس کے کان پر بھِن بھِناتی' اور پھر اُس طرف اُڑ کر جاتی جدھر ملاّح ڈوب رہا تھا۔ اب مچھیرے کو غصّہ آگیا۔ اُس نے سوچا' اِس مکھّی کو مار دینا چاہیئے۔ وہ اُس کے پیچھے کشتی چلانے لگا' اور وہ اُڑتی ہوئی اُس جگہ پہنچ گئی جہاں ملاّح ڈوب رہا تھا۔ مچھیرے نے ملاّح کا ہاتھ پکڑ کر اُسے کشتی میں کھینچ لیا۔

ساحِل پر اُتر کر ملاّح نے گہری لمبی سانس لی اور بولا "حیرت کی بات ہے! میں ایک آدمی اور وہ ایک مکھّی ---- دونوں نے ایک دوسرے کی جان بچائی!" (س۔ ل)

تعلیم و تربیت

No. 4756 The Taleem-o-Tarbiat, Lahore
PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES Price Rs. 15.00

Sharjeel Ahmed

ERCZSONS PRIMARY SCIENCE

FEROZSONS EDUCATIONAL

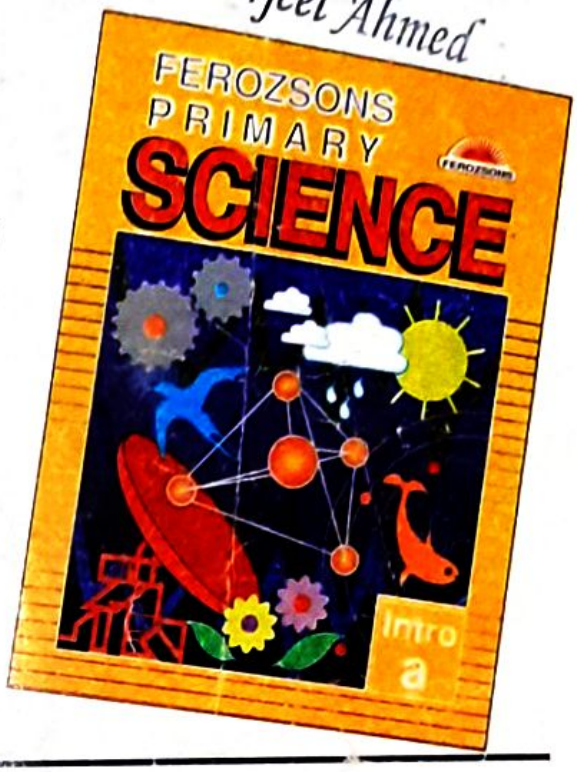

ARY SCIENCE is a complete series of twelve books, well suited to the educational needs of Medium Schools worldwide.
es is to present the fundamentals of science in a which children can easily understand and assimilate. They will only remember the facts but also remember that the learning of m was a joyful experience.
h book is divided into a number of parts which cover the main as of study and are colour-coded for easy reference.
the books are richly illustrated in colour and each drawing has n specially chosen to complement and support the text.
h book commences with an interest-stimulating quiz and ends an extra-curricular exercise entitled 'Do You Know?'

Intro a — Part 1 Human beings; Part 2 Healthcare and safety; Part 3 Living and non-living things; Part 4 Animals; Part 5 Objects — 10141 2, 35.00

1a — Part 1 Human beings; Part 2 Things around us; Part 3 Living and non-living things; Part 4 Animals; Part 5 Animals and their babies — 969 0 10092 0, Rs. 40.00

2a — Part 1 Human beings; Part 2 Health and safety; Part 3 Animals; Part 4 More about animals; Part 5 Sound; Part 6 Magnetism — 969 0 10094 7, Rs. 40.00

Intro b — Part 1 Plants; Part 2 Food; Part 3 Light and Heat; Part 4 Movement; Part 5 Distance; Part 6 Earth and Sky; Part 7 Time — 10142 0, 35.00

1b — Part 1 Objects; Part 2 Plants; Part 3 Force and machines; Part 4 Energy; Part 5 Sound; Part 6 Magnetism; Part 7 Heat and temperature; Part 8 Light and shadow; Part 9 Time — 969 0 10093 9, Rs. 40.00

2b — Part 1 Colours; Part 2 Plants; Part 3 Force and machines; Part 4 Energy; Part 5 Electricity; Part 6 Material and matter; Part 7 Time — 969 0 10095 5, Rs. 40.00

3a — Part 1 Human beings; Part 2 Healthcare and safety; Part 3 Animals; Part 4 Sound; Part 5 Magnetism; Part 6 More about animals — 10096 3, 40.00

4a — Part 1 Human beings; Part 2 Healthcare and safety; Part 3 Living things and their needs; Part 4 Living things protect themselves; Part 5 Sound; Part 6 Magnetism — 969 0 10098 X, Rs. 40.00

5a — Part 1 Human beings; Part 2 Healthcare and safety; Part 3 Animals; Part 4 Sound — 969 0 10100 5, Rs. 50.00

3b — Part 1 Light and colour; Part 2 Plants; Part 3 Heat energy; Part 4 Light energy; Part 5 Force and energy; Part 6 Materials and matter; Part 7 Earth and atmosphere; Part 8 Time — 10097 1, 40.00

4b — Part 1 Colours; Part 2 Plants; Part 3 Heat and temperature; Part 4 Electricity; Part 5 Time — 969 0 10099 8, Rs. 40.00

5b — Part 1 Plants; Part 2 Animals; Part 3 Force and motion; Part 4 Heat and electricity; Part 5 Matter; Part 6 Earth and atmosphere; Part 7 Time — 969 0 10101 3, Rs. 50.00

(...s are subject to change without notice)

under publication:

...ozsons Primary English
...ozsons Primary Mathematics
...ozsons Primary Atlas.

FEROZSONS (Pvt) LTD.
LAHORE RAWALPINDI KARACHI

Lahore: 60, Shahrah-e-Quaid-e-Azam, Phones: 6301196-98 Fax: 6278816
Rawalpindi: 277, Peshawar Road, Rawalpindi, Phone: 563503 Fax: 564273
Karachi: 1st Floor, Mehran Heights, Main Clifton Road, Karachi
Phones: 570527-570534-537730 Fax: 570534